هَمُّ الآخرة

(فکرِ آخرت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	عظیم الشان پیشین گوئی	۷
۳	شبہ کا جواب	۸
۴	اللہ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا	۹
۵	حقیقتِ ایمان	۱۱
۶	عہدِ الست اور اس کا اثر	۱۲
۷	باہم محبت و عداوت کی وجہ	۱۳
۸	اللہ کا کلام صَوت سے منزہ ہے	۱۵
۹	بچوں کے لئے متبحّر عالم ہونا چاہئے	۱۶
۱۰	اضطراری اعتقاد معتبر نہیں	۱۷
۱۱	معجزات کی ضرورت وحقیقت	۱۸
۱۲	عظیم پیشین گوئی	۲۰
۱۳	آج کل کی پیشین گوئیوں کا حال	۲۱
۱۴	قرآن کا طرز مناظرہ اور الزامی جواب	۲۲

۱۵	عطائی طبیبوں کا طریقِ علاج	۲۳
۱۶	صرف ترجمہ قرآن دیکھ کر عمل کرنے والوں کی مثالیں	۲۵
۱۷	عطائی طبیبوں کے مثال	۲۶
۱۸	شیوخ کی پہچان	۲۸
۱۹	شیخ کامل کا اتباع کرو	۳۰
۲۰	حُبِّ دنیا ونسیانِ آخرت کا مرض	۳۱
۲۱	مرض کو معمولی سمجھنا خطرناک ہے	۳۱
۲۲	علاج اور توجہ نہ کرنے سے مرض بڑھتا ہے	۳۳
۲۳	لوگوں کی حماقتیں	۳۴
۲۴	کفر کی اصل	۳۵
۲۵	کسبِ دُنیا وحُبِّ دنیا کا فرق	۳۶
۲۶	حُبِّ دنیا کی حقیقت	۳۸
۲۷	ہدیہ یا رشوت	۴۰
۲۸	حرص دنیا کا مذموم درجہ	۴۰
۲۹	حُبِّ رسول ﷺ کا معیار	۴۲
۳۰	حضور ﷺ کے ساتھ عقلی محبت مغلوب ہے	۴۴
۳۱	حضور ﷺ کے ساتھ صرف طبعی محبت ہونا کافی نہیں	۴۵
۳۲	ایک شبہ کا ازالہ	۴۵
۳۳	ترتیب بیان	۴۶

۳۴	عورتوں پر حُبِ دنیا کا غلبہ	۴۸
۳۵	پانی پت کی عورتوں کی خوبی	۴۹
۳۶	دکھاوے کے لئے عمدہ لباس پہننے سے عزت نہیں ہوتی	۴۹
۳۷	عزت لباس سے نہیں ہنر سے ہوتی ہے	۵۰
۳۸	تفکر کی ضرورت	۵۱
۳۹	ترقی مطلوب	۵۳
۴۰	تفکر فی الدین	۵۴
۴۱	دنیادار پریشانی سے خالی نہیں	۵۵
۴۲	مغلوبیت دنیا کے درجات	۵۷
۴۳	راحت وآرام کی حقیقت	۵۸
۴۴	اہل اللہ موت سے نہیں گھبراتے ہیں	۶۰
۴۵	پل صراط پر اہل اللہ کا حال	۶۲
۴۶	دولت ایمان قابل قدر ہے	۶۳
۴۷	اہل اللہ کے راحت میں ہونے کا راز	۶۳
۴۸	شبہ کا جواب	۶۴
۴۹	حکایت	۶۵
۵۰	توجہ آخرت کا طریقہ	۶۶
۵۱	طلب دنیا کی حقیقت	۶۶
۵۲	تفسیر آیت کے ذیل میں طلب آخرت کی حقیقت	۶۷

۵۳	آخرت کی کثیر جزائیں	۷۰
۵۴	جاہلانہ اعتراض کا جواب	۷۰
۵۵	جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والے کا حال	۷۲
۵۶	جنت اور دوزخ کی وُسعت	۷۲
۵۷	جنت کی وسعت پر شبہ کا جواب	۷۳
۵۸	استوی علی العرش کے معنی	۷۴
۵۹	طالب علمانہ شبہ کا جواب	۷۵
۶۰	آج کل ہر جاہل مجتہد ہے	۶۷
۶۱	تبلیغ کے آداب	۷۸
۶۲	طلبِ آخرت	۷۹
۶۳	طلب کی حقیقت	۸۰
۶۴	حصولِ آخرت کا طریقہ	۸۰
۶۵	توجہ متعارف کی ناپسندیدگی کی وجہ	۸۲
۶۶	حکایت	۸۲
۶۷	کام میں لگے رہو	۸۳
۶۸	ارتکاب گناہ پر توبہ کرلو اپنے کو مردود نہ سمجھو	۸۴
۶۰	بندہ کا اللہ سے تعلق کیسا ہو	۸۴

وعظ

هَمُّ الآخرة
(فکرِ آخرت)

انہماک فی الدنیا وفقدان فکر فی الآخرت کے متعلق حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ ۵/ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ کو اپنے مکان پر ۳۰ کے قریب جمع شدہ افراد کے مجمع میں بعض مستورات کی فرمائش پر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا۔ جو چار گھنٹوں میں ختم ہوا۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قلم بند فرمایا۔

خلیل احمد تھانوی
۳/ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ یَعْلَمُوْنَ ظَاھِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَھُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ ھُمْ غٰفِلُوْنَ﴾(۱)

عظیم الشان پیشین گوئی

یہ ایک آیت ہے سورۂ روم کی اس سے قبل حق تعالیٰ نے ایک پیشین گوئی بیان فرمائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیقِ رسالت میں کیونکہ پیشین گوئی کا ایسے شخص کی زبان سے نکلنا جس نے اس کے اسباب کو حاصل نہ کیا ہو اور دعوی نبوت کا کرتا ہو۔ پھر پیشین گوئی بھی ہو بہو واقع ہوجائے یہ علامت ہے اس کی کہ اس شخص کو عالمِ غیب سے تعلق ہے اور اس حالت میں یہ معجزہ ہوگا کہ پیشین گوئی کے بعد اسی کے مطابق وقوع ہوجائے۔ خصوصا پیشین گوئی بھی ایسی معمولی نہیں جس کو طبیب بھی ظاہری آثار سے معلوم کرلیں جیسا کہ آج کل بعض جاہلوں کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں کہ فلاں شخص اتنی مدت میں ہلاک ہوجائیگا یا فلاں مرض میں مبتلا ہوگا، بلکہ

(۱) ''یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کے ظاہر کو مانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں'' سورۂ مریم: ۷۔

ایسی عظیم الشان پیشین گوئی ہے جس کا تعلق دو سلطنتوں سے ہے اور تعلق بھی ایسا عجیب جو عقولِ ظاہرہ کے خلاف اور آثار موجودہ سے مستبعد ہے(۱)۔ پھر پیشین گوئی بھی مہمل نہیں بلکہ صاف صاف تحدید (۲) کے ساتھ اور اس میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اس وقت جن سلطنتوں کو غلبہ ہوا ہے چند سال میں اس کو مغلوبیت ہوگی اور مغلوب سلطنت کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور اس مدت میں اس کا وقوع بھی ہوگیا۔ تو یہ علامت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی اور یہ علامت اس وقت تھی جب کہ نبوت ختم نہ ہوئی تھی اور اب جب کہ نبوت ختم ہوچکی، اگر کوئی پیشین گوئی کرے اور اس کی پیشین گوئی بھی غلط نہ ہو تب بھی وہ نبی نہ ہوگا اور نہ یہ نبوت کی علامت ہوگی۔ بلکہ اگر وہ ولی متبع شریعت ہے تو اس کو کرامت کہا جائے گا اور غیر متبع شریعت ہے تو استدراج ہوگا۔

شبہ کا جواب

رہا یہ شبہ کہ اگر وہ پیشین گوئی کرنے والا دعویٰ نبوت بھی کرے اور اس کے ساتھ اس کی پیشین گوئی غلط بھی نہ ہو تو کیا جب بھی یہ نبوت کی علامت نہ ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال محض فرض و تقدیر پر ہے جو واقعات کے خلاف ہے یعنی عادۃ اللہ میں ایسا نہیں ہوسکتا اور ایسے احتمالاتِ فرضیہ حقیقتِ واقعہ میں قادح نہیں (۳) ہوتے اور یہ سوال ایسا ہے جیسے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے سوال کیا تھا جو درس کے وقت ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ ایک دن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی تم کوئی سوال نہیں کرتے۔ تم بھی کچھ پوچھا کرو۔ اُس نے کہا، بہت اچھا، اب سوال کیا کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد امام

(۱) موجودہ آثار سے یہ بات بعید ہے (۲) تعیین (۳) رکاوٹ۔

نے ایک دن یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ غروبِ آفتاب کے بعد فوراً افطار کر لینا چاہئے تو وہ شاگرد پوچھتے ہیں کہ حضرت اگر کسی دن آفتاب غروب ہی نہ ہو تو کیا کرے؟ امام ہنسنے لگے اور فرمایا کہ بھائی تمہارا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

تو اس سوال کا منشا محض فرض وتقدیر تھا ایسے ہی اس سوال کا مبنی ہے اور ایسے احتمالات قابلِ التفات نہیں ہوتے۔ اور بفرضِ محال اگر اس کو فرض بھی کر لیا جائے تو جواب یہ ہے کہ یہ علامت اس وقت ہے جب کسی نص قطعی سے نبوت ثابت ہو چکی ہو ورنہ ایسا واقعہ علامت نہ ہوگی۔

اللہ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا

حاصل آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس جگہ بہت بڑی پیشین گوئی فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿وَعْدَاللّٰہِ ط لَایُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ﴾ ''یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتے'' تو یہ پیشین گوئی ضرور واقع ہوگی۔ پیشین گوئی کے صحیح طور پر واقع ہونے کا مقتضی یہ تھا کہ لوگ آپ ﷺ کی نبوت کو مان لیتے مگر بہت لوگ پھر بھی منکر رہے۔ حق تعالیٰ اس آیت میں اس کی وجہ اور سبب بتلاتے ہیں چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے: ﴿وَعْدَاللّٰہِ ط لَایُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾(۱)

اس کے جملۂ آخیرہ میں شکایت ہے کہ لوگوں کو اس کی خبر نہیں (کہ معجزات علامات نبوت ہیں اور یہ پیشین گوئی بھی بوجہ اخبار عن الغیب ہونے کے معجزہ ہے) اور خبر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اس کا عقیدہ نہیں یا عقیدہ تو ہے مگر اس کے موافق علم نہیں اور چونکہ علم کے واسطے عمل لازم ہے

(۱) ''اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' سورۂ مریم: ۶۔

گو درجہ التزام ہی میں ہو۔ جب عمل نہ ہوا تو اس سے علم کی بھی نفی ہوتی ہے اس لئے ﴿لا یعلمون﴾ فرمایا اور میں نے جو یہ قید بڑھائی ہے کہ گو درجہ التزام ہی میں ہو اس سے دفعہ دخل مقدر ہے(۱)۔ ایک اشکال کو میں نے رفع کیا ہے وہ یہ کہ بہت سے مسلمان نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے حالانکہ وہ ان کی فرضیت کے معتقد ہیں تو کیا عدم عمل سے یہاں بھی علم کی نفی کی جائیگی؟۔

جواب یہ ہے کہ التزام عمل بھی عمل کا ایک درجہ ہے (۲) اور یہ لوگ گو عمل نہیں کرتے مگر فرضیت عمل کے ملتزم تو ہیں (۳) اور کفار تو التزام بھی نہ کرتے تھے۔ غرض جس کا یہ عقیدہ ہوگا کہ پیشین گوئی معجزہ ہے اور معجزہ علامتِ نبوت ہے وہ پیشین گوئی کے موقع پر ضرور ایمان لائے گا اور یہی عمل ہے کیونکہ ایمان عملِ قلبی ہے تو اس اعتقادِ سابق کی وجہ سے ایمان وتصدیق ضرور پیدا ہوگی۔ اس درجہ میں اعتقاد کو عمل سے تخلف نہ ہوگا۔ (۴)

رہا اظہار باللسان تو فیما بینہ و بین اللہ (۵) یہ رکنِ ایمان نہیں۔ یہ مسئلہ متکلم فیہ ہے (۶) مگر مذہب منصور یہ ہے کہ ترک اظہار صرف معصیت ہے (۷) جب کہ اظہار پر قدرت ہو یعنی اگر باوجود قدرت کے اظہار نہ کیا تو عنداللہ مومن تو ہوگا مگر عاصی بھی ہوگا۔

رہا ایمان عندالناس وفی احکام الدنیا (۸) تو اس کے لئے اظہار شرط

---

(۱) عبارت پر وارد ایک اشکال کو دور کرنا ہے (۲) عمل کو لازم سمجھنا بھی عمل کا ایک درجہ ہے (۳) اگرچہ عمل نہیں کرتے لیکن عمل کرنے کو لازم وضروری سمجھتے ہیں (۴) اس اعتقاد کی وجہ سے عمل کرنے سے پیچھے نہیں رہیگا (۵) رہ گیا زبان سے اظہار کرنا تو یہ بندے اور اللہ کے درمیان ہے ایمان کا رکن نہیں (۶) اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے (۷) صحیح مذہب یہ ہے کہ اظہار کا ترک کرنا صرف گناہ ہے (۸) رہا لوگوں کے سامنے اظہار اور اس پر احکام شریعت جاری ہونا اس کے لئے ایمان کا زبان سے اظہار شرط ہے۔

ہے۔ جب تک کوئی زبان سے اپنے کو مسلمان نہ کہے گا ہم اس کو کافر ہی کہیں گے بالخصوص جب کہ وہ اظہار پر قادر بھی ہو اور کفارِ مکہ تو مغلوب وعاجز نہ تھے بلکہ مسلمان خود ان سے ڈرتے تھے۔ اس حالت میں ہم کو کیسے احتمال ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں ایمان ہے۔ اور اگر فرضاً کسی کے دل میں ایمان ہوتا بھی تب بھی ان کا برتاؤ حضور اقدس سے اور مسلمانوں سے ایسا تھا جو امارت تکذیب (۱) سے تھا جیسے القاء مصحف فی القازورۃ (۲) امارت تکذیب ہے۔ اسی طرح کفار کا رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا اور مسلمانوں سے مقابلہ مجادلہ کرنا بھی امارت تکذیب (۳) سے تھا۔ اس کے ساتھ اُن کا وہ ایمانِ قلبی عنداللہ بھی معتبر نہ ہوتا کیونکہ ایمان عنداللہ کے لئے صرف تصدیقِ قلبی کافی نہیں بلکہ یہ بھی شرط ہے کہ امارات تکذیب سے احتراز کیا جائے۔ (۴)

حقیقتِ ایمان

اب میں ایک اشکال طالب علمانہ کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا علم تھا چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾ (۵)

اس میں استفہامِ انکاری ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو رسول ﷺ کا رسول ہونا معلوم تھا۔ دوسری جگہ اہلِ کتاب کے متعلق صاف طور پر ارشاد ہے۔

---

(۱) جو ان کے انکار کی علامت تھا (۲) جیسے قرآن پاک کو گندگی میں ڈالنا انکار کی علامت ہے (۳) اسی طرح کفار کا حضور ﷺ کو تکلیف دینا آپ کی نبوت کا انکار کرنا ان کے انکار کی علامت تھا (۴) انکار ایمان کی علامات سے بچا جائے (۵) ''یہ لوگ اپنے رسول سے واقف نہ تھے اس وجہ سے ان کے منکر تھے'' سورۂ مومنون: ۶۹۔

﴿یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ﴾(۱) تو سمجھ لیجئے کہ یہ معرفت اضطراریہ تھی اور معرفت اضطراریہ ایمان نہیں بلکہ ایمان عملِ اختیاری کا نام ہے۔

عہدِ اَلست اور اس کا اثر

اس معرفت اضطرایہ(۲) کی ایسی مثال ہے جیسے دھوپ کو دیکھ کر ہر شخص اعتقادِ ضیا پر مضطر ہے(۳)۔ اسی طرح حضور ﷺ کو دیکھنے والے آپ ﷺ کی معرفت میں مضطر تھے مگر اختیار سے تصدیق سب نے نہیں کی اور اعتقادِ توحید میں تو ہر شخص مضطر ہے(۴)۔ کوئی دہری کوئی ملحد کوئی کافر اس سے خالی نہیں اور یہ اثر ہے عہدِ الست کا کیونکہ حق تعالیٰ اس عہد کی حکمت میں خود فرماتے ہیں:

(اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ)(۵) کہ یہ عہد ہم نے اس واسطے لیا تا کہ ''تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے'' معلوم ہوا کہ اس عہد کے بعد توحید سے بے خبر کوئی نہ رہا۔ سب کو اس کا اصل مضمون یاد ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہم کو تو وہ عہد یاد نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یاد کے یہ معنی نہیں کہ تمام تفاصیل وخصوصیات بھی یاد ہوں کہ عہد کس وقت اور کس جگہ لیا گیا تھا اور اس وقت ہمارے دائیں بائیں کون تھا۔ بلکہ یاد کے معنی یہ ہیں کہ اصل مضمون یاد ہو۔

دیکھئے! آمدن کے معنی آنا سب کو یاد ہیں جس نے بھی آمدنامہ پڑھا ہے مگر خصوصیات، وقت، علم یاد نہیں کہ کس استاد نے پڑھایا تھا اور کہاں کس جگہ کس دن پڑھایا تھا اور اگر شاذ و نادر کسی کا حافظہ بہت ہی قوی ہو اور اسے سب خصوصیات

(۱) ''وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں سورۂ بقرہ: ۱۴۶ (۲) اس غیر اختیاری پہچان کی ایسی مثال ہے (۳) دھوپ دیکھ کر ہر آدمی روشنی کا یقین کرنے پر مجبور ہے (۴) تو حید الٰہی کے اعتقاد پر ہر شخص مجبور ہے (۵) سورۂ اعراف: ۱۷۲۔

بھی یاد ہوں تو ایسی مثالیں عہدِ الست کے بارے میں بھی مل سکتی ہیں چنانچہ عارفین میں بعض اہلِ کشف کو عہدِ الست کی خصوصیات یاد تھیں۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم کو عہدِ الست کا لیا جانا خوب یاد ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ﴾ فرمایا ہے اس وقت تمام روحیں سیدنا رسول اللہ ﷺ کا منہ تک رہی تھیں کہ پہلے آپ ﷺ جواب دیں تو پھر ہم بھی جواب دیں چنانچہ سب سے پہلے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿ بلٰی ﴾ اس کے بعد سب نے کہا ﴿ بلٰی ﴾۔

باہم محبت وعداوت کی وجہ

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ حدیث میں جو وارد ہے: ((الارواح جنود مجندة فما تعارف منها أتلف وما تناكر منها اختلف)) کہ ''روحیں لشکروں کی طرح جمع کی گئی تھیں جن میں باہم وہاں تعارف ہوگیا ان میں یہاں بھی اُلفت ہوگئی اور جن میں وہاں تعارف نہیں ہوا ان میں اختلاف ہوگیا''

تو وہ بزرگ کہتے ہیں کہ اس تعارف و تناکر کی صورت یہ ہوئی کہ جب ارواح جمع کی گئی ہیں تو بعض تو رو در رو تھے (۱) اُن میں تو طرفین (۲) سے الفت ہوگئی اور بعض رد در پشت تھے (۳) کہ ایک کا منہ دوسرے کی طرف اور اس کی پشت دوسرے کی طرف ان میں ایک کو تو دوسرے سے اُلفت ہوگئی جس کا منہ دوسرے کی طرف تھا اور دوسرے کو اس سے نفرت ہوئی جس کی پشت اس کی طرف تھی۔ اور بعض پشت در پشت تھے (۴) کہ اس کی پشت اس کی طرف اس کی پشت اس کی طرف۔ ان دونوں میں دنیا میں بھی نفرت ہوئی۔ اور اپنے اصحاب سے فرمایا

(۱) آمنے سامنے (۲) دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی (۳) ایک کا منہ دوسرے کی پیٹھ کی طرف (۴) دونوں کی پیٹھ ایک دوسرے کی طرف۔

کرتے تھے کہ فلاں میری داہنی طرف تھا فلاں بائیں طرف تھا وہکذا۔

حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ جب اول روح کو جسم میں داخل ہونے کا حکم ہوا تو اس وقت حق تعالیٰ کا کلام روح نے سنا اور وہ فلاں لہجہ میں تھا جو مجھ کو یاد ہے۔ اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اسی کی لذت میں مست ہوکر روح جسم میں داخل ہوگئی۔ یہ وہ جسم ہے جس میں روح کو داخل کر کے عہد اَلست لیا گیا۔

یہاں یہ شبہ ہوگا کہ حق تعالیٰ کا کلام تو صوت سے منزّہ ہے چنانچہ حضرت شیخ فرید رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے ع قول او را لحن نے آواز نے (۱)

بعض خشک اہلِ ظاہر حضرت فرید کو شیخ نہیں سمجھتے بلکہ خالی صوفی سمجھتے ہیں، کیونکہ وحدۃ الوجود میں ان کے بعض اشعار ذرا زیادہ تیز ہیں جن سے اہلِ ظاہر کو بوجہ اصطلاحات سے واقف نہ ہونے کے دھوکا ہوا ہے چنانچہ ان کا ایک طویل قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار متجلی ست از در و دیوار (۲)

مگر یہ ان صاحبوں کی غلطی ہے، حضرت شیخ فرید رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عارف ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان کی بہت تعریف فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم (۳)

اور مصلح و مربی بھی ہیں چنانچہ ان کا پندنامہ اس پر شاہد عدل ہے (۴) اسی میں قبر پرستوں کے خلاف ارشاد ہے ؎

---

(۱) اس کا قول لب ولہجہ سے منزہ ہے (۲) آنکھیں کھولو تو معلوم ہو کہ محبوب کا جلوہ تو در و دیوار سے ظاہر ہے (۳) شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ عشق الٰہی کے سات شہر گھوم چکے میں تو ابھی ایک گلی کے نشہ میں ہی مخمور ہوں (۴) اس پر گواہ ہے۔

دربلا یاری مخواہ از ہیچ کس زانکہ نبود جُز خدا فریاد رس (۱)

ایسا شخص خالی کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ تو ان کا قول ہے اعمال توحیدیہ وشرکیہ میں اور عقائد میں ان کا یہ قول ہے ع قول او را لحن نے آواز نے (۲) جو بالکل اہلِ سنت کا مذہب ہے پھر ان کو خالی کیسے کہا جاسکتا ہے۔

اللہ کا کلام صَوت سے منزّہ ہے

غرض اتنے بڑے عارف کا یہ قول ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام صوت سے منزہ ہے (۳) اور ائمہ متکلمین نے بھی اس پر اتفاق کیا ہے۔ پھر حضرت سلطان جی کے ارشاد کے کیا معنی؟

تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت حق تعالیٰ کے کلام کی تجلی مثالی ہوئی تھی۔ اس تجلی مثالی میں کلامِ الٰہی صوت سے مقترن تھا (۴) اور ایسی ہی تجلی تھی جیسے شجرۂ طور پر تجلی مثالی ہوئی تھی جس کی وجہ سے درخت سے آواز آنے لگی۔ وہ صوت بھی کلام الٰہی کی نہ تھی بلکہ کلام الٰہی کی تجلی مثالی کا اثر تھا کہ شجرہ میں آواز پیدا ہوگئی (۵)۔ مگر ظاہر ہے کہ گو تجلی مثالی عین صفت نہیں مگر اس کو صفتِ الٰہی سے بہ نسبت دوسرے حوادث کے ایک خاص تعلق ضرور ہے تو اس کو مجازاً کلامِ الٰہی کہنا صحیح ہے۔ اور اس میں بہت سے آثارِ حقیقی کلامِ الٰہی کے موجود ہوتے ہیں منجملہ ان کے یہ اثر بھی ہے کہ اس میں لذت بے حد ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کو کلامِ الٰہی حقیقی سے غایت درجہ قرب ہے۔ بہر حال اب کوئی اشکال نہیں تو حضرت سلطان جی کو وہ

---

(۱) مصیبت کو دور کرنے کی خواہش سوائے خدا کے کسی سے نہ کر خدا کے علاوہ کسی سے فریاد کرنا مناسب نہیں (۲) اللہ کے قول میں لب ولہجہ نہیں ہے (۳) اللہ تعالیٰ کے کلام ہیں آواز نہیں ہے (۴) اس تجلی مثالی میں آواز ملی ہوئی تھی (۵) وہ آواز بھی اللہ کے کلام کی نہیں تھی تجلی الٰہی کا اثر تھا جس سے درخت میں آواز پیدا ہوئی۔

صَوت اب تک یاد تھی۔ سبحان اللہ! ایسے ہی حضرات کی نسبت شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

الست از ازل ہمچناں شان بگوش　　بفریادِ قالوا بلیٰ در خروش (۱)

غرض شاذ و نادر (۲) یہاں بھی بعض افراد ایسے موجود ہیں جن کو عہدِ الست کی خصوصیات یاد ہیں۔ مگر سب کو یہ خصوصیات یاد نہیں کیونکہ سب کا صاحبِ کشف ہونا ضروری نہیں اور جیسے شاذ و نادر صحیح علم کی خصوصیات بعض کو یاد رہ جاتی ہیں اسی طرح غلط علم کی بھی یاد رہ جاتی ہے۔

بچوں کے لئے متبحّر عالم (۳) ہونا چاہیئے

کانپور میں ایک طالب علم نے ضَـرَبَ کے مثال دادن (۴) کے معنی میں آنے کا انکار کیا۔ میں نے کہا کہ تم ضَرَبَ کے یہ معنی پڑھ چکے ہو۔ کہا کس کتاب میں؟ میں نے کہا، منشعب میں۔ اس پر ان کو بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ منشعب میں یہ معنی ہرگز مذکور نہیں۔ میں نے منشعب منگائی اور ان سے کہا کہ اس میں ضَرَبَ کے جو معنی لکھے ہیں پڑھو۔ انہوں نے پڑھا الضرب زدن۔ رفتن بر روئے زمین و پدید کردن، یہاں آکر وقف کردیا۔ میں نے کہا کہ پدید کردن پر ٹھہر کیوں گئے؟ آگے پڑھو۔ تو وہ آگے پڑھتے ہیں مثل تصریفه ضرب یضرب فهـــو ضـــارب الخ۔ میں نے کہا یہ کیا۔ یہ مثل تصریفہ کیسا؟ کہنے لگے مجھے تو

(۱) اللہ نے ازل میں جو کلام ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ کہا اور حضور نے اور سب نے اس کے جواب میں ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ کہا اس کی لذت اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے (۲) بہت کم (۳) قابل اور لائق استاد (۴) طالب علم نے جب یہ کہا کہ ضرب کا معنی دادن (دیدینا) درست نہیں تو حضرت نے کتاب سے اس کے معنی اس طرح سمجھائے کہ الضرب کے معنی مارنے اور زمین پر چلنے اور ظاہر کرنے کے بھی آتے لیکن صرف میں صیغہ بدلنے سے معنی بدلتے ہیں کہ ضرب کا مطلب اس نے مارا اور یضرب کا مارتا ہے یا مارلیگا اور ضارب کا مطلب مارنے والا ہے اسی طرح جب موقع محل بدل جائے گا تو ضرب کے معنی بجائے مارنے کے زمین پر چلنے اور ظاہر کرنے کے ہوتے ہیں جیسے قرآن پاک میں ہے ﴿وضرب لهم مثل الرجلين﴾ آپ مثال بیان کیجئے ان دو مردوں کی تو یہاں معنی بیان کرنے کے ہیں مارنے کے نہیں سیاق کلام سے یہ بات سمجھ میں آرہی ہے۔

فلاں مولوی صاحب نے یونہی پڑھایا تھا۔ میں نے کہا بندۂ خدا! آخر تم نے یہ بھی دیکھا کہ اور سب جگہ تو تصریفہ ہے یہاں مثل تصریفہ کیوں ہوگیا؟ کہنے لگے، ہاں اب خیال ہوتا ہے کہ واقعی بڑی غلطی تھی۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ بچوں کو تعلیم کے لئے متبحر اور لائق عالم (۱) کو تلاش کرنا چاہیئے ورنہ بہت باتیں غلط بتلائی جائیں گی اور بچپن کی غلطیاں ذہن میں مرکوز ہوجائیں گی (۲)۔ بہر حال النادر کالمعدوم (۳) باقی اکثر تو خصوصیات یاد نہیں رہتیں مگر کسی کے نزدیک بھی یاد کے لئے سب خصوصیات کا یاد ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اصل مضمون کا یاد ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔

اِضطراری اعتقاد معتبر نہیں

سو اس طرح عہد اَلست کا مضمون بھی سب کو یاد ہے۔ مُلحد بھی گو زبان سے وجود صانع (۴) کے منکر ہیں مگر دل سے ان کو بھی اقرار ہے۔ چنانچہ بعض مُلحدوں نے بعد میں اقرار کیا۔ ایک مُلحد کا قول ہے میں نے اس اَمر کی مشق کرنا شروع کی کہ اپنے ذہن سے ہر چیز کی نفی کرسکوں۔ چنانچہ میں سب کی نفی پر قادر ہوگیا اور ہر چیز سے اپنے ذہن کو خالی کرلیتا تھا (اور یہ محض مشق ہے کچھ کمال نہیں) پھر وہ کہتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اور تو چیزوں کی نفی کرلیتا ہوں مگر ابھی اپنی ہستی کی نفی پر قادر نہیں ہوا۔ تو میں نے عرصہ تک اس کی مشق کی اور اس میں بھی کامیاب ہوگیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ابھی ایک چیز اور باقی ہے جس کی نفی

(۱) قابل اور لائق استاد (۲) ذہن میں جم جائیں گی (۳) کسی چیز کا کم پیش آنا ایسا ہی ہے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں (۴) اللہ کے وجود کے منکر ہیں۔

نہیں ہوئی اور وہ ہستی صانع عالم کا اعتقاد ہے(۱)۔ میں نے عرصہ دراز تک اس کی نفی کی کوشش مگر اس کی نفی پر قادر نہ ہوسکا۔ بالآخر مجبور ہوکر میں نے صانع عالم کے وجود کا اقرار کیا مگر توحید کا منکر ہونا چاہا عرصہ تک میں نے توحید صانع عالم کی نفی میں کوشش کی اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی بالآخر توحید کا بھی قائل ہونا پڑا۔ تو دیکھئے! عہد الست کا مضمون ایسا یاد ہے کہ انسان ذہن سے اپنے وجود کی نفی پر قادر ہوسکتا ہے مگر وجودِ صانع اور توحیدِ صانع کی نفی پر قادر نہیں ہوسکتا(۲)۔ اس سے بڑھ کر یاد اور کیا ہوگی۔

مگر یہ اعتقاد اِضطراری ہے۔ یہ ایمان کے لئے کافی نہیں۔ ایمان اعتقاد اختیاری ہے کہ اپنی طرف سے بھی دل کو اس طرف مائل کرے۔ کفار مکہ واہلِ کتاب میں معرفتِ اضطرار یہ ہی تھی جس کو ﴿اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَھُمْ﴾ ﴿کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُم﴾ میں ظاہر کیا گیا ہے اعتقاد اختیاری نہ تھا۔ اسی لئے ان کو کافر کہا گیا اور اسی واسے میں نے کہا تھا کہ ﴿ولکن اکثرھم لا یعلمون﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو پیشین گوئی کا معجزہ ہونا اور معجزہ کا علامت نبوت ہونا معلوم نہیں، یا علم تو ہے مگر عمل نہیں اور علم کے واسطے عمل لازم ہے گو درجۂ التزام ہی میں ہو(۳)۔ اس درجۂ التزام ہی کا نام اعتقادِ اختیاری ہے اور یہی شرط ایمان ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ یہاں اس بات کا سبب بتلاتے ہیں کہ یہ لوگ باوجود دلائل ومعجزات قائم ہونے کے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو کیوں نہیں مانتے۔

معجزات کی ضرورت وحقیقت

صاحبو! یہاں ایک بات اور سمجھ لو کہ معجزات کی ضرورت عوام کے لئے

---

(۱) دنیا بنانے والے کا یقین ہے (۲) اللہ کی اور اس کی وحدانیت کی نفی پر قادر نہیں (۳) یعنی اگرچہ اس کو صرف لازم ہی سمجھتا ہے۔

ہے۔ اہلِ فہم کے لئے تو سب سے بڑا معجزہ اور تھا وہ کیا؟ حضور ﷺ کی مجموعی حالت۔ اہلِ فہم وبصیرت کے لئے صرف حضور ﷺ کی ذات والا صفات ہی کافی معجزہ تھی۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ((فلما تبینت وجهه عرفت انه ليس بوجه كذاب))(۱)

نبی کا چہرہ تو بھلا کیوں ممتاز نہ ہو جب کہ ولی کے چہرہ کی یہ حالت ہے کہ ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور　　کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

نورِ حق ظاہر بود اندر ولے　　نیک بیں باشی اگر صاحب دلے (۲)

اور یہ نور دیکھنے ہی سے مدرک ہوسکتا ہے، بیان میں نہیں آسکتا۔ اسی کو ایک عارف کہتے ہیں ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید　　لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید (۳)

اور یہی مطلب ہے بعض علمائے محققین کے اس قول کا کہ معجزات دلیلِ نبوت نہیں مطلب یہ ہے کہ اہلِ بصیرت واہلِ فہم کے لئے دلیلِ نبوت کا انحصار معجزات میں نہیں ان کے اخلاق بھی دلیل ہیں۔ باقی عوام کے لئے تو معجزات ہی ضروری ہیں اور کفار عوام ہی ہیں اور دنیا میں اہلِ فہم کم ہیں عوام ہی زیادہ ہیں۔ اس لئے نبی کے واسطے صاحبِ معجزہ ہونا ضروری ہے۔ اور جب عوام کے حق میں معجزات دلیل نبوت ہیں تو اہلِ فہم کے حق میں تو دلیلِ نبوت کیوں نہ ہوں گے۔ ان کے لئے تو بدرجۂ اولیٰ دلیلِ نبوت ہوں گے۔

---

(۱) جوں ہی آپ ﷺ کے رخ انور پر نظر پڑی میں پہچان گیا کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے (۲) ولی اللہ کے چہرے سے نورِ حق ظاہر ہوتا ہے اگر کسی صاحب دل کے پاس بیٹھ گئے نیک ہوجاؤ گے (۳) میں حیران ہوں کہ اگر اس نے اس دلبر کی تصویر بنا بھی لی تو اس کے ناز وادا کو اس تصویر میں کیسے ظاہر کریگا۔

عظیم پیشین گوئی کی تفصیل

اب میں مختصر طور پر اس پیشین گوئی کا قصہ بیان کرتا ہوں جس کی تفصیل کتبِ سیر میں مذکور ہے کہ ہجرت سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اس وقت ایک سال فارس و روم میں لڑائی ہوئی اور اہلِ فارس کو رومیوں پر غلبہ ہوا جس سے کفار قریش کو خوشی حاصل ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ تم بھی اہلِ کتاب ہونے کے مدّعی ہو اور رومی بھی اہلِ کتاب ہیں اور اہلِ فارس تمہارے نزدیک مشرک ہیں تو اہلِ فارس کا رومیوں پر غالب ہونا ہمارے لئے نیک فال ہے کہ اسی طرہ ہم بھی تم پر غالب ہونگے۔

اللہ تعالیٰ کفار کا منہ بند کرنے کے لئے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ نو سال کے اندر اندر رومی فارسیوں پر غالب آئیں گے اور یہ پیشین گوئی بہت بڑی پیشین گوئی ہے معمولی بات نہیں کیونکہ اسکا تعلق دو سلطنتوں سے ہے پھر بھی ظاہر حالت کے خلاف ہے جو کسی کی عقل میں نہیں آسکتی کیونکہ روم کی سلطنت فارس کے مقابلہ میں چھوٹی بھی تھی اور جدید و حادث بھی تھی (۱) اور فارس کی سلطنت بڑی بھی تھی اور پرانی بھی تھی۔ ابتداء میں ایک ہی خاندان میں چلی آرہی تھی کیونکہ مؤرخین کا قول (اور واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے) کہ کیومرث جو آدم علیہ السلام کا پوتا یا پرپوتا ہے وہ اس سلطنت کا اول بادشاہ ہے اور اس وقت سے اخیر تک ایک ہی سلسلہ میں سلطنت رہی۔ کسی غنیم سے (۲) اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اسی لئے اُس کے خزائن بہت زیادہ تھے۔ ہزاروں برس کی بادشاہت میں ظاہر ہے کہ کس قدر خزائن ہوں گے (۳) اور اس کی فوجیں بھی بہت شائستہ اور مستحکم تھیں۔

(۱) چھوٹی بھی تھی اور ابھی نئی نئی وجود میں آئی تھی (۲) کسی دشمن (۳) کتنے زیادہ خزانے ہوں گے۔

ان میں بڑے بڑے بہادر موجود تھے۔ پھر وسعتِ رقبہ کی وجہ سے (۱) اس کی رعایا بھی زیادہ تھی اس لئے اس کی فوجیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ تو ایسی سلطنت کے متعلق یہ پیشین گوئی کہ وہ ایک چھوٹی اور نئی سلطنت سے مغلوب ہوجائے گی، بہت بڑی پیشین گوئی ہے۔

آج کل کی پیشین گوئیوں کا حال

پھر قرآن کی باتیں صاف صاف ہوتی ہیں۔ گول مول پیشین گوئی نہیں ہے۔ جیسے آج کل نجومی پیشین گوئی کیا کرتے ہیں۔ اول تو وہ کثیر الوقوع واقعات بیان کیا کرتے ہیں کہ اس نے کہیں راستہ میں کچھ کھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بچا ہوا کون ہے۔ راستہ میں کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو پان ہی کھا لیتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ اس نے جنگل میں ایک جگہ پیشاب کیا ہے۔ ایسا بھی سفر میں اکثر ہوجاتا ہے۔ پھر پیشین گوئی بھی کرتے ہیں تو مجمل اور مبہم۔

چنانچہ ایک نجومی سے کوئی پوچھتا کہ میری بیوی کو حمل ہے، بتلاؤ کیا ہوگا؟ تو وہ زبان سے کچھ نہ کہتا بلکہ ایک پرچہ پر یہ عبارت لکھ دیتا کہ ''لڑکا نہ لڑکی'' اگر لڑکا ہوا تو کہہ دیتا کہ ہم نے کہا نہ تھا کہ لڑکا ہوگا نہ کہ لڑکی۔ اور لڑکی ہوتی تو کہتا کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ''لڑکا نہ'' بلکہ لڑکی ہوگی۔ اب یہ ''نہ'' پہلے کے ساتھ لگ گیا، اور جو اسقاط ہوگیا اور کچھ نہ ہوا تو اب وہ ''نہ'' دونوں سے لگ گیا کہ ''لڑکا نہ لڑکی'' کتابت میں لہجہ تو ہوتا نہیں اس لئے وقوع کے بعد وہ جس طرح چاہتا لہجہ بدل کر اسے اپنے موافق کرلیا کرتا۔ لہجہ کو بھی مطلب کے ادا کرنے میں بہت بڑا دخل ہے اسی لئے حنفیہ کے نزدیک عمل صحابی (خلاف روایت) موجب خلل ہے (۲) کیونکہ

(۱) رقبہ زمین زیادہ ہونے کی وجہ سے (۲) اگر کسی صحابی سے کوئی روایت ایسی نقل ہو کہ اس کا اپنا عمل اس روایت کے خلاف ہو تو اس کا محدثین اعتبار نہیں کرتے۔

ہم نے حضور ﷺ کا لہجہ اسی طرح دوسرے قرائن مقامیہ نہیں دیکھا (۱) اور صحابی نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ جو مراد ہم نے الفاظ سے سمجھی ہے وہ صحیح نہ ہو۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کی پیشین گوئی نجومیوں کی پیشین گوئی کی طرح مجمل و مبہم نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی نہیں کہ قیامت تک کی پیشین گوئی ہو۔ ﴿سَيُغْلَبُوْنَ﴾ پر سین داخل کر کے قرب کو بتلا دیا ہے کہ بہت جلد عنقریب رومی غالب ہوں گے۔ پھر ﴿فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ (۲) کے ساتھ مقید کر کے اس کو بالکل واضح کر دیا کہ نو سال کے اندر اندر ایسا ہوگا۔

ایسی پیشین گوئی نہیں جیسا کہ ایک پاگل نے اس زمانہ میں پیشین گوئی کی تھی کہ فلاں عورت سے میرا نکاح ہوگا۔ جب اس کا نکاح دوسری سے ہو گیا تو دعویٰ کیا گیا کہ یہ بیوہ ہو جائے گی اور پھر میرے نکاح میں آئے گی۔ مگر ایسا بھی نہ ہوا وہ یہ حسرت لے کر ہی قبر میں چلا گیا تو اس کے تابعین نے اس پیشین گوئی میں یہ تاویل کی کہ اس عورت کی اولاد میں سے کوئی لڑکی اس مدعی اولاد میں سے کسی لڑکے کے نکاح میں آئے گی۔ سبحان اللہ! ایسی بے تکی تاویل سے بھی اگر پیشین گوئی سچی ہو سکتی ہے۔ تو ہر شخص کی پیشین گوئی سچی ہو جایا کرے گی اور کسی کی کوئی بات بھی غلط نہ ہوا کرے گی۔

قرآن کا طرز مناظرہ اور الزامی جواب

سو قرآن کی پیشین گوئیاں ایسی نہیں ہوتیں بلکہ صاف اور واضح ہوتی ہیں اور حق تعالیٰ نے روم کے غلبہ اور فارس کی مغلوبیت کی پیشین گوئی اس لئے بیان فرمائی کہ کفارِ مکہ نے فارس کے غلبہ سے یہ فال لی تھی کہ ہم بھی مسلمانوں پر اسی

(۱) ہم نے حضور ﷺ کا لہجہ دیکھا نہ وہ قرآئن ہمارے سامنے جس میں یہ بات کہی گئی اور صحابی نے سب کچھ دیکھا اس لئے اس کے عمل اعتبار ہوگا (۲) چند سالوں میں لفظ ''بضع'' تین سے نو تک کے عدد پر بولا جاتا ہے اس لئے نو سال کہا۔

طرح غالب ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے اس دلیل کے مقدمات پر کلام نہیں فرمایا کہ ایک قوم کے دوسری قوم پر غلبہ ہونے سے اس کی نظیر کا غلبہ دوسری نظیر پر غالب نہیں بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ چند سال میں اس کے برعکس کا وقوع ہوگا کہ روم کو فارس پر غلب ہوگا۔ اس وقت تم کو اس کے خلاف فال کا قائل ہونا پڑے گا۔ سبحان اللہ! کیا عجب طرزِ مناظرہ ہے اور یہ الزامی جواب ہے۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کو ایک دوسری واقعی اور حقیقی مسرت سناتے ہیں کہ غلبہ روم سے تو تم کو یہ خوشی ہوگی کہ کفار کی پہلی فال کا لغو ہونا واضح ہوجائے گا اور اس کے ساتھ ہی عین اسی زمانہ تم کو حقیقی مسرت بھی حاصل ہوگی ﴿وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ ط يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ﴾(۱) اس دن تم کو کفارِ مکہ پر غالب ہونے سے حقیقی خوشی بھی حاصل ہوگی بخلاف کفارِ مکہ کے کہ ان کو اس وقت محض خیالی مسرت ہے اور آئندہ ان کو حقیقی ذلت اور رسوائی حاصل ہوگی۔ تو حق تعالیٰ نے اس جگہ دو پیشین گوئیاں بیان فرمائی ہیں۔ ایک غلبۂ روم کی فارس پر، دوسری غلبۂ اہلِ اسلام کی کفار پر۔ یہ تو کفار کی بات کا جواب تھا۔

عطائی طبیبوں کا طریقِ علاج

پھر چونکہ قرآن مجید طبِّ روحانی ہے، اس لئے حق تعالیٰ محض پیشین گوئی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ اس کے بعد بتلاتے ہیں کہ اس پیشین گوئی کے وقوع پر کفار کو ایمان لے آنا چاہیئے تھا مگر وہ پھر بھی منکر رہیں گے۔ اس کا سبب معلوم کرنا چاہیئے۔ حق تعالیٰ محض آثار کا علاج نہیں کرتے بلکہ اصل مرض کا علاج کرتے ہیں۔ مگر افسوس! ہم کو اس طبِّ روحانی کا اہتمام نہیں طبِّ جسمانی کا تو اتنا اہتمام ہے

(۱) ''اور اُس روز مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہونگے وہ جس کو چاہے غالب کردیتا ہے'' سورۂ مریم: ۴، ۵۔

کہ ذرا طبیعت میں تغیّر ہوا اور طبیب کی تلاش کرنے لگے مگر طبِّ روحانی سے اتنی بے پروائی کی کہ اس کی طرف التفات ہی نہیں۔ اس کی نسبت فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں
صحتِ ایں حس بجوئید از طبیب صحتِ آں حس بجوئید از حبیب (۱)

پھر طبِّ جسمانی میں کامل طبیب وہ ہوتا ہے جو اصل مرض کا علاج کرے اور وہ طبیب ناقص ہوتا ہے جو آثار کا علاج کرتا ہے کہ کسی نے کھانسی کی شکایت کی تو ملٹھی بتلادی۔ بخار کی شکایت کی تو گل گاؤ زبان لکھ دیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں دیکھتا کہ بخار کا سبب کیا ہے، کھانسی کی وجہ کیا ہے، اس سبب کا استیصال کرنا چاہئے (۲)۔

اسی قسم کے ایک حکیم جی ہمارے قصبہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ یہ غضب کرتے ہیں کہ طب کی دو تین کتابیں اردو کی دیکھ کر علاج کرنے لگے اور لطیفہ یہ کرتے ہیں کہ مریضوں سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تشخیص مرض تو کسی اور حکیم سے کرالو، علاج میں کردوں گا کوئی اس سے پوچھے کہ جب تم تشخیص نہیں کرسکتے تو علاج کیونکر کروگے کیونکہ تشخیص مرض کے بعد تشخیص مزاج کی ضرورت ہے کتابوں کے نسخے ہر مریض کے مزاج کے موافق نہیں ہوتے۔ گو کسی خاص حالت میں مرض کے موافق ہوں تشخیص مرض کے بعد طبیبِ کامل بھی کتابوں ہی سے نسخے دیکھ کر یا یاد کرکے علاج کریگا مگر اس کے ساتھ وہ مزاجِ مریض کی رعایت کرکے کتابی نسخہ میں کچھ تغیر وتبدل بھی ضرور کردے گا اور جس کو تشخیص بالکل نہیں آتی وہ اس کی رعایت کیونکر کرے گا۔ مگر عوام اس شخص سے اس لئے علاج کراتے ہیں کہ تشخیص فعل آنی ہے جو ایک دفعہ نبض دکھلانے سے ہوجاتی ہے اور علاجِ فعلِ زمانی ہے (۳)۔ اس کے

(۱) یونانی طبیبوں کی حکیمانہ باتیں تو سیکھ چکے اب ایمانی حکیمانہ باتیں بھی سیکھو جسم کی صحت کی دوا تو ڈاکٹر سے ملے گی لیکن صحت روحانی کی دوا میرے حبیب ﷺ سے ملے گی (۲) اس سبب کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا چاہئے (۳) مرض کی تشخیص تو ایک لحہ میں ہوجائیگی البتہ علاج مرض میں کافی زمانہ صرف ہوگا۔

لئے زیادہ مدت کی ضرورت ہے اور لائق طبیب کو بار بار بلانے میں فیس اور کرایہ کا خرچ بہت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لائق طبیب کو ایک دفعہ بلاکر تشخیص اس سے کرالیتے ہیں اور علاج اس سستے عطائی سے کرالیتے ہیں۔

صرف ترجمہ قرآن دیکھ کر عمل کرنے والوں کی مثالیں

ایسے ہی ترجمہ دیکھ کر طبیب بننے والوں پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ کانپور مطبع نظامی میں ایک شخص کا خط آیا جس میں املاء بھی درست نہ تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں فتویٰ بھی دے لیتا ہوں ۔میرے پاس شرح دقیّہ (۱) بروزن عطیہ کا اردو ترجمہ موجود ہے اس سے مسائل کا جواب دے لیتا ہوں۔ فتویٰ بھی لکھ لیتا ہوں اور وعظ بھی کہہ لیتا ہوں۔ میرے پاس وعظ کی بھی ایک کتاب ہے۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ آپ سے سب فیض تو جاری ہوگئے۔ مگر طبِ کا فیض نہیں ہے اس کو بھی جاری کردیجئے۔ تو اگر آپ کے مطبع میں ''طبِ احسانی'' اردو ہو تو میرے نام ارسال کردیجئے تاکہ یہ فیض بھی جاری کردوں۔ (میرے نزدیک یہاں ''فا'' کی جگہ ''حا'' ہونا چاہیئے تھی)۔

ایسے ہی ترجمہ دیکھنے والوں کی ایک یہ بھی حکایت ہے کہ ایک غیر مقلد صاحب جب امام بنتے تو ہل ہل کر نماز پڑھاتے اور تنہا نماز میں ذرا حرکت نہ کرتے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو کہا، حدیث میں آیا ہے۔ ((من ام منکم فلیخفف)) جس کا ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا کہ ''جو امام بنے وہ ہلکی نماز پڑھائے''۔ ان حضرت نے ہلکی کو یوں پڑھا کہ ہا کو کسرہ دیا اور یاء کو مجہول پڑھا یعنی ''ہل کے'' نماز پڑھائے۔ اس لئے وہ امامت کے وقت خوب ہلتے تھے۔ خدا بچائے اس جہالت سے۔

(۱) شرح وقایہ کو اپنی جہالت سے شرح دقیہ کہا۔

ایسے ہی ایک دنیا پرست مولوی نے ایک شخص کو فتویٰ دے دیا تھا جو میں نے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا کہ ساس سے نکاح کرنا جائز ہے اور دلیل یہ بیان کی۔ ساس وہ ہے جو منکوحہ کی ماں ہو اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح ہوا ہو۔ اور اس شخص کی بیوی جاہل ہے جس کی زبان سے کفریات کا صدور غالب ہے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان ہوئی نہیں۔ اس لئے وہ منکوحہ بنکاح صحیح نہیں تو اس کی ماں ساس بھی نہیں۔ کم بخت نے محض گمان وتخمین پر نکاح کو بھی فاسد کر دیا اور منکوحہ کی ماں کو بھی حلال کر دیا اور حرمت مصاہرت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔

عطائی طبیبوں کی مثال

یہ واقعات تو میں نے استطراداً(۱) بیان کر دیئے۔ اصل گفتگو یہ تھی کہ عطائی طبیب آثار کا علاج کرتے ہیں اسباب کا علاج نہیں کرتا۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گاؤں میں ایک شخص تاڑ کے درخت پر اتفاق سے چڑھ گیا۔ جب اوپر پہنچ گیا تو زمین دیکھ کر اُترتے ہوئے بہت ڈر لگا۔ شاید اس کو چڑھنا آتا ہوگا اور اُترنا نہ آتا ہوگا۔ طریقِ باطن میں بھی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ترقی تو کرتے ہیں مگر نزول نہیں کرتے جیسے مجذوبین۔ یہ لوگ کامل نہیں بلکہ ناقص ہیں۔ کامل وہ ہے جو عروج ونزول دونوں کا جامع ہو(۲) اب وہ لگا چلانے اور شور مچانے کہ مجھے کسی طرح اتارو۔ سب لوگ حیران ہوگئے کہ کس طرح اُتاریں۔ آخرکار بوجھ بجھکڑ کو بلا کر لائے جو سب سے زیادہ گاؤں میں عاقل مشہور

(۱) ضمناً بیان کر دیئے (۲) اترنے چڑھنے کی دونوں حالتوں سے واقف ہو جیسے کامل صوفی وہ ہے جو قبض وبسط دونوں سے واقف ہو۔

تھا۔اس نے اول تو اوپر نیچے دیکھا اور سوچا۔ پھر کہا بس سمجھ میں آ گیا۔ ایک لمبا سا رسہ لاؤ اور اس کے پاس پھینکو اور اس سے کہو کہ اپنی کمر سے باندھ لے۔ چنانچہ یہ سب کچھ کیا گیا۔ پھر کہا اس رسے کو زور سے جھٹکا دے کر کھینچو۔ لوگوں نے جو جھٹکا دیا تو اس کا بدن تو نیچے آ گیا مگر رُوح اُوپر کو اُڑ گئی۔ لوگوں نے بوجھ بجھکڑ سے کہا کہ یہ کیا ہوا۔ کہنے لگا، اس کی قسمت! میں نے تو اسی تدبیر سے بہت آدمیوں کو کنویں سے نکالا ہے۔ یہی حال ان عطائی طبیبوں کا ہے کہ صرف ظاہری آثار کا علاج کرتے ہیں، اسباب کو نہیں دیکھتے۔ ایک ہی نسخہ کو ہر جگہ برتتے ہیں، اسباب مختلفہ کو نہیں دیکھتے جیسے اس احمق نے رسی کی ایک ہی تدبیر یاد کر کے کنویں میں بھی استعمال کیا اور درخت میں بھی۔

مجھے ایک عطائی نے آنت اترنے کی دوا دی تھی جو کان میں ڈالی جاتی تھی۔ میں ان عطائیوں کا علاج کبھی نہیں کرتا مگر اس وقت یہ خیال ہوا کہ خارجی علاج ہے اس کا کیا حرج ہے ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود (۱)

میں نے اس دوا کا استعمال کیا تو اس سے تمام بدن میں برودت کا ایسا غلبہ ہوا کہ حرارت غریزیہ (۲) بھی بہت کم ہوگئی۔ آخر میں نے اسے چھوڑا اور طبیب سے رجوع کیا۔ کئی دن کے بعد مختلف ادویہ سے حرارتِ غریزیہ اپنے حال پر آئی۔

---

(۱) جب موت کا وقت آجائے طبیب کی عقل ماری جاتی ہے (۲) انسان کے جسم میں جو گرمی ہے اس کو حرارت غریزیہ کہتے ہیں جس پر حیات موقوف ہے یہ ختم ہوجائے تو جسم ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور موت واقع ہوجاتی ہے۔

شیوخ کی پہچان

جس طرح طبِ جسمانی میں بعض عطائی ہیں ایسے ہی طریق باطن میں بعض شیوخ اناڑی اور عطائی ہوتے ہیں۔ اس لئے میں شیوخ کی پہچان بتاتا ہوں جن میں ایک قبل رجوع ہے ایک بعد رجوع ہے (۱)۔ قبل رجوع تو یہ بات دیکھنی چاہیئے کہ کاملانِ عصر (۲) کا اس سے کیا برتاؤ ہے وہ اس کے متعلق کیا گواہی دیتے ہیں۔ اگر وہ اس کے کمال کے معتقد ہوں تو اس کو کامل سمجھنا چاہیے۔

دوسری بات بعد رجوع کے قابلِ لحاظ یہ ہے کہ ابھی اس سے بیعت ہونے میں جلدی نہ کرو بلکہ اس سے اپنا حال عرض کر کے کام کرنا شروع کرو۔ اور اگر وہ بدونِ بیعت (۳) کے کام نہ بتلائے تو وہ ناقص ہے، اس کو چھوڑو، کسی اور سے رجوع کرو، اور اول کام کرو پھر کام شروع کر کے اپنے حالات سے اس کو اطلاع دو اور یہ دیکھو کہ اس کے جوابات سے اطمینان و تسلی ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر اطمینان ہوتا ہے تو سمجھو کہ یہ شخص محقق ہے منزل شناس ہے (۴) اور اطمینان نہ ہوتا ہو تو سمجھو کہ ناقص ہے جو احوالِ سالکین کی حقیقت کو نہیں سمجھتا، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

وعدہا باشد حقیقی دل پذیر وعدہا باشد مجازی تاسہ گیر (۵)

''تاسہ گیر'' کے معنی ہیں اضطراب جھوٹے وعدوں سے اضطراب ہوتا ہے اور سچی باتوں سے تسلی ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی ہے ((الصدق طمانية والكذب ريبة)) (۶)

---

(۱) ایک تعلق قائم کرنے سے پہلے ایک قائم کرنے کے بعد (۲) زمانے میں جو کامل علماء ہیں ان کا اس سے کیسا برتاؤ ہے (۳) بیعت کئے بغیر (۴) منزل کو پہچانتا ہے (۵) سچے وعدوں سے دل خوش ہوتا ہے جھوٹے وعدوں سے پریشانی بڑھتی ہے (۶) سچ باعث اطمینان ہے اور جھوٹ باعث تردّد۔

وعدہ اہلِ کرم گنج رواں وعدۂ نا اہلِ چوں رنجِ رواں(۱)

عارف شیراز رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی اناڑیوں کی شکایت فرماتے ہیں اور یہ بھی ایک علامت ہے شیخ کے غیر محقق ہونے کی جو عارف کے کلام میں مذکور ہے ؎

خستگاں را کہ طلب باشد وقوت نبود گر تو بیداد کنی شرطِ مروّت نبود(۲)

بعض شیوخ ہر شخص کو یہ بتلاتے ہیں کہ چھ مہینے ہمارے پاس رہو اب ایک شخص صاحب اہل وعیال ہے اس کو بھی یہی بتلا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ کو تو ہمت نہیں شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ پھر ہمارے پاس کیوں آئے۔ یہ جواب اس کے غیر محقق ہونے کی علامت ہے۔ اگر کوئی طبیب پچاس روپیہ کا نسخہ لکھے اور غریب آدمی افلاس کا عذر کرے اور طبیب یوں کہے کہ پھر ہمارے پاس کیوں آئے تو وہ طبیب نہیں ہے۔ طبیبِ کامل وہ ہے جو غریبوں کا علاج دھیلے اور پیسہ کی دوا سے کرے۔

ہمارے حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رئیس کو جامن کی کونپلوں (۳) کا استعمال کرنا بتلایا۔ ایک رئیس کا علاج دودھ میں اکاس بیل (۴) کو جوش دے کر پینا بتلا دیا اور ایک شخص کو سویاں اُبال کر کھانا بتلایا۔ آپ کے نسخے ہمیشہ پیسہ دو پیسہ کے ہوتے تھے اور بعض دفعہ بالکل مُفت کی جنگلی دوا بتلاتے تھے۔ اطباء دیوبند کہا کرتے تھے کہ یہ مولانا کی کرامت ہے طِبّ نہیں کہ ایسی معمولی چیزوں سے نفع ہوجاتا ہے۔ مولانا اس کو سن کر ہنستے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ لوگ طبّ سے ہی واقف نہیں۔

---

(۱) اہل کرم کا وعدہ بہتے ہوئے خزانے کی طرح ہے اور نااہلوں کا وعدہ رنج مسلسل کی طرح ہے (۲) کمزوروں کو جو کہ طلب رکھتے ہیں لیکن ان میں طاقت نہیں ہے اگر تو محروم رکھے تو یہ مروت نہیں ہے (۳) جامن کے نئے نکلے ہوئے پتے (۴) باڑ پھر جو پیلی پیلی معمولی بیل چڑھی ہوتی ہے۔

شیخ کامل کا اتباع کرو

تو محقق کی تلاش کرو اور جب محقق مل جائے تو اس کی اطاعت کرو اور اس کے سامنے اپنی تجویز ورائے کو فنا کردو(۱)۔ پہلے یہ حالت تھی کہ طالبین مشائخ کی ایسی اطاعت وانقیاد(۲) کرتے تھے کہ اگر کسی کو یہ کہا جاتا کہ تم کسی دوسرے سے تعلیم حاصل کرو تو وہ اس پر راضی ہوجاتے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کی اطاعت سے ہم کو نفع ہوگا اور خواہ ہم کسی سے رجوع کریں ہم کو انہی سے فیض ہوگا۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی فرمایا، تم مولانا محمد قاسم صاحب سے بیعت ہوجاؤ وہ زیادہ کامل ہیں۔ وہ مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے مولانا گنگوہی پر ٹالا اور فرمایا، تم انہی سے بیعت ہوجاؤ۔ وہ زیادہ کامل ہیں۔ وہ پھر گنگوہ حاضر ہوا۔ حضرت نے پھر مولانا محمد قاسم پر ٹالا۔ وہ پھر ان کے پاس آیا۔ اسی طرح کئی بار غریب کو دوڑایا۔ آخر ایک دفعہ گنگوہ میں یا نانوتہ میں قرانُ السعیدین ہوا(۳) اور دونوں حضرات مسجد جارہے تھے۔ وہ شخص راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور کہا، اب تم دونوں جمع ہو۔ میرے متعلق فیصلہ کرلو اور کوئی نہ کوئی مجھے بیعت کرے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہوگا، میں راستہ نہ چھوڑوں گا۔ اس وقت دونوں میں سے کسی نے اُس کو بیعت کرلیا مگر آج کل حالت یہ ہے کہ اگر کسی کو دوسرے سے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا جائے تو وہ اطاعت نہیں کرتا اور یوں سمجھتا ہے کہ مجھے ٹال دیا اور غلط مشورہ دیا جب اطاعت وانقیاد کا یہ عالم ہو تو پھر نفع کیونکر ہو۔ یہ گفتگو درمیان میں استطراداً آ گئی۔ میں یہ

(۱) مٹادو (۲) فرمانبرداری (۳) دونوں نیک بخت ہستیاں اکٹھی مل گئیں یعنی مولانا قسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی دونوں بزرگ اکٹھے مل گئے۔

کہہ رہا تھا کہ محقق وہ ہے جو سبب کا علاج کرے محض آثار کا علاج نہ کرے اور یہی محقق کی علامت ہے۔

حبِّ دنیا ونسیانِ آخرت کا مرض

اور حق تعالیٰ کے کلام کی یہی شان ہے کہ اس میں مرض کی تشخیص بھی ہوتی ہے، اسباب امراض بھی بیان کئے جاتے ہیں اور اسباب کا علاج کیا جاتا ہے اور یہاں کسی مریض کو یاس (۱) کا جواب نہیں دیا جاتا۔ افسوس ایسا کامل مطب اور اس کی ایسی بے قدری کی ہم اس کے لکھنے پڑھنے کا ذرا اہتمام نہیں کرتے۔ گو تمہید طویل ہوگئی ہے مگر اس سے آپ کو اس سببِ مرض کا شدید وقابل اہتمام ہونا تو معلوم ہوگیا ہوگا۔

تو حق تعالیٰ اس مقام پر کفار کے انکار واعراض کا سبب بتلاتے ہیں کہ یہ باوجود قیام دلائل واظہار معجزات کے ایمان نہیں لاتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ محض دنیا کو جانتے ہیں یعنی ان کو دنیا کی طرف خاص درجہ کی توجہ ہے جس کی تفصیل آگے بتلاؤنگا اور ان کو آخرت سے غفلت ہے۔ خلاصہ سب کا دو باتیں ہیں، ایک توجہ الی الدنیا دوسرے غفلت عن الآخرۃ (۲)۔ اپنے ذہنوں کو ٹٹول کے دیکھئے کہ اس کو کوئی شخص مرض سمجھتا ہے۔ تامل سے (۳) معلوم ہوگا کہ کوئی بھی اس کو مرض نہیں سمجھتا اور اگر کوئی مرض سمجھتا ہے تو معمولی مرض سمجھتا ہے۔

مرض کو معمولی سمجھنا خطرناک ہے

اور جس مرض کو معمولی مرض سمجھا جائے وہ سخت خطرناک ہے۔ حالؔی کا شعر ہے، گو حالؔی کا کلام پڑھنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر ان اشعار میں صحیح مضمون بیان

(۱) مایوسی کا جواب (۲) دنیا کی طرف توجہ اور آخرت سے غفلت (۳) غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا۔

کیا گیا ہے اس لئے پڑھتا ہوں ؎

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا　　　مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟
کہا دُکھ نہیں کوئی دُنیا میں ایسا　　　کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں　　　کہے جو طبیب اُس کو ہذیان سمجھیں

حقیقت میں اگر سخت سے سخت مرض کا علاج اہتمام سے کیا جائے تو وہ آسان ہوجاتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے: ((مامن داء الاوانز اللّٰه له دواءً)) ''حق تعالیٰ نے ہر مرض کے لئے دوا نازل کی ہے''۔اور یہ عام ہے امراضِ ظاہرہ کو بھی باطنہ کو بھی۔البتہ اگر کسی مرض کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا جائے اور اس کا علاج نہ کیا جائے یا اہتمام سے نہ کیا جائے تو وہی سخت خطرناک ہے کیونکہ وہ اندر اندر جڑ پکڑے گا۔ پھر اخیر میں اہتمام وتوجہ کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہی حالت اس مرض کے ساتھ ہماری ہورہی ہے کہ ہم نے اس کو معمولی بات سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کفر کی جڑ ہے اور کفر کا منشا وسبب ہے(۱)۔کفار کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی اس آیت کی دلالت سے توجہ الی الدنیا اور غفلت عن الآخرت ہے(۲) جس کو ہم معمولی خیال سمجھتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ اصل فرع سے اشد ہوتی ہے (۳) پس یہ اصل سہل ہے(۴) تو اسی قاعدہ کے موافق کیا نعوذ باللہ کفر کو بھی معمولی اور سہل کہا جاوے گا؟ ہرگز نہیں! تو ثابت ہوگیا کہ یہ مرض حبِّ دنیا ونسیانِ آخرت کفر سے بھی اشد ہے اور گو خدا کا شکر ہے کہ ہم میں اس درجہ کی غفلت عن الآخرت (۵) تو نہیں جس درجہ کی

(۱) کفر پیدا ہونے کا ذریعہ (۲) دنیا کی طرف متوجہ ہونا اور آخرت سے غفلت (۳) جڑ شاخ سے زیادہ سخت ہوتی ہے (۴) آسان (۵) آخرت سے اتنی لاپرواہی تو نہیں۔

کفار میں ہے اور وہی کفر سے اشد بھی ہے کیوں کہ وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں محض دنیا ہی کو جانتے ہیں اور ہم آخرت کے قائل ہیں اور ہمارا اعتقاد ہے کہ دنیا کے سوا ایک دوسرا عالم بھی ہے۔ البتہ حالت یہ ہے کہ اعمال میں اس کا استحضار نہیں، نہ اس کے لئے سامان کی فکر ہے تو گو غفلت کا اعلیٰ درجہ ہمارے اندر نہ ہو مگر جس درجہ کی بھی ہے وہ معمولی بات نہیں بلکہ بہت سخت چیز ہے کیونکہ اس ادنیٰ درجہ کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے۔

علاج اور توجہ نہ کرنے سے مرض بڑھتا ہے

زکام، کھانسی اول معمولی درجہ کی ہوتی ہے، پھر وہی رفتہ رفتہ دق اور سل کی صورت اختیار کر لیتی ہے(۱)۔ جب کہ اس کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا جائے، اسی طرح افیون وتمباکو شروع میں قلیل مقدار سے کھایا جاتا ہے پھر وہ خود ترقی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص ایک رتی افیون کا کھانے والا تھا سال بھر کے بعد وہ کئی ماشے کھانے لگتا ہے کیونکہ نشہ کی چیز میں خاصیت ہے کہ وہ خود بخود بڑھتی ہے۔ اور حُبِّ دنیا بھی ایک نشہ ہے چنانچہ مشہور ہے کہ سو روپیہ میں ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبِّ دنیا روز بروز ترقی کرتی رہتی ہے۔ جس شخص کی تنخواہ بیس روپے ہے وہ کہتا ہے کہ پچاس ہوجائے تو بہت اچھا ہے۔ جب پچاس ہوگئے تو کہتا ہے کہ ستر ہوجائیں۔ پھر ستر ہوگئے تو اب سو کی تمنا ہے۔ سو ہوگئے تو اس سے آگے کی تمنا ہے۔ بس وہ حال ہے کہ لا ینتھٰی ارب۔ قلت والشعر للمتنبی واللّٰہ ما ابلغہ حیث قال:

وربھا احتسب الانسان غایتھا وفاجاتہ بامر غیر محتسب

وما قضی احمد منھا لبانتہ ولا انتھی ارب الا الی ارب

سو لوگوں کو دنیا کا تو ایسا نشہ ہے مگر آخرت میں یہ حالت ہے کہ ہر شخص

(۱) ٹی بی اور دائی دست کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس کے لئے قلیل درجہ پر قانع ہے۔ اگر کسی کو ترقی آخرت کی نصیحت کی جائے تو کہتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز تو پڑھتے ہیں اور کیا جان نکالو گے۔ اور بعض تو آخرت کی طرف بھی اسی وقت تک متوجہ ہوتے ہیں جب تک دنیا سلامت رہے اور اگر دنیا کا نقصان کسی وجہ سے ہوگیا تو وہ آخرت کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ گویا خدا کی اطاعت و عبادت محض اس خوشامد سے کرتے ہیں کہ وہ ان کی دنیا کو سنوارتے رہیں اور اگر دین پر عمل کرتے ہوئے اتفاقاً دنیا بگڑ جائے تو یہ خدا سے بھی بگڑ بیٹھتے ہیں۔

لوگوں کی حماقتیں

چنانچہ ایک دیہاتی نے روزہ رکھا تھا۔ اتفاق سے اسی دن اس کی بھینس مرگئی تو کم بخت نے لوٹا کو منہ لگا کر پانی پیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہتا ہے اور رکھالے روجا (روزہ) اسی طرح ایک بڈھے کی اولاد بڑھاپے میں اس کی خدمت نہ کرتی تھی تو وہ گھر چھوڑ کر مسجد میں آپڑا اور نماز روزہ کرنے لگا۔ اتفاق سے لڑکوں کو کھیتی میں نقصان پہنچا، کچھ مویشی مرگئے اور کھیت برباد ہوگیا تو وہ یہ کہنے لگا کہ یہ ساری نحوست اس بڈھے کی نماز کی ہے (نعوذ باللہ) سب مل کر اس کے پاس آئے کہ ہم آج سے تیری خدمت کیا کریں گے۔ تو گھر پر رَہ اور نماز نہ پڑھا کر۔ اس نے کہا، اچھا! مگر دیکھو! وعدہ خلافی نہ کرنا، ورنہ میں پھر بوریا بدھنا[1] لے کر نماز شروع کردوں گا۔ سب نے پکا وعدہ کیا اور بڈھے نے نماز چھوڑ دی اور خوب گھی دودھ کھانے لگا۔ پھر جب کبھی لڑکے اس کی خدمت میں کمی کرتے، وہ کہتا کہ ارے لائیو میرے اوجو کا کلہڑا (وضو کا لوٹا) لڑکے پھر ڈر جاتے اور خوشامد کرتے کہ تم نماز نہ پڑھو، اب سے خدمت میں کمی نہ ہوگی۔ تو اس بڈھے نے نماز کے ڈراوے میں ان سے خوب خدمت کروائی۔

(۱) اپنی چٹائی لے کر اور لوٹا لے کر نماز شروع کردونگا۔

مگر ایسے احمق تو مسلمانوں میں آج کل بہت کم ہیں اور جو ایسا ہو اُس سے گفتگو ہی نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہیں جو نماز روزہ کو منحوس سمجھتے ہیں۔ جو مسلمان نماز روزہ کو برکت کی چیز بھی سمجھتے ہیں ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ہر شخص جس درجہ میں ہے اسی پر قانع ہے، اس سے آگے بڑھنے کی نہ فکر ہے نہ کوشش ہے۔ امامِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق خوب مضمون لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ارى الملوك بادنى الدين قد قنعوا وما ارهم رضوا بالعشير بالدون
فاستغن بالدين عن دنيا الملوك كما استغنى الملوك بدنياهم عن الدين

یعنی میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ دین میں تو ادنیٰ درجہ پر قانع ہیں مگر عیشِ دنیوی میں ادنیٰ حالت میں قانع نہیں ہیں۔ آگے دین داروں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم بھی بادشاہوں کی دنیا سے ویسے ہی مستغنی ہوجاؤ جیسے وہ دُنیا کو لے کر دین سے بے پرواہوگئے۔ تم دنیا میں ان کو نہیں گھٹا سکتے تو دین میں تو نیچا دکھادو۔ یہ تو غفلت کے متعلق کلام تھا۔

کفر کی اصل

اب توجہ الی الدنیا کو سنیئے، ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو بہ نسبتِ آخرت کے دنیا کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ گو کفار جیسا انہماک نہ ہو[1]۔ ان کو تو ہر وقت اسی میں انہماک ہے۔ آخرت کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ تو ہم کو گو ایسا انہماک نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ انہماک کا ایک درجہ ہمارے اندر بھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ

(۱) اگرچہ اتنا ہم دنیا میں منہمک نہ ہوں جتنے کافر ہیں۔

آخرت سے زیادہ دنیا کی طلب ہے اور اس کے لئے آخرت سے زیادہ کوشش کی جاتی ہے۔ اور میں بھی افیون کی مثال سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہلکا مرض بھی اشد ہوجاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس وجہ سے کہ ہلکا سمجھ کر اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا، زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بخار ہلکا ہلکا زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تو رگوں میں پیوست ہوجاتا ہے اور پتہ نہیں لگتا۔ یاد رکھو! حُبِّ دنیا کفر کی اصل ہے۔ اس کو معمولی مت سمجھو۔ اور یہ بات کہ جڑ کو معمولی نہ سمجھا جائے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ بزرگوں کے اقوال میری تائید کررہے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

علّت ابلیس اناخیر بدست ایں مرض درنفس ہر مخلوق ہست

اس میں تصریح ہے کہ ابلیس کے مردود ہونے کا اصلی سبب تکبر تھا اور یہ مرض ہر شخص کے اندر موجود ہے گو اس درجہ کا نہ ہو مگر جب شہر میں آگ لگتی ہے تو اس کی ابتدا ہمیشہ معمولی سی بات سے ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایک دیا سلائی سے گھر میں آگ لگ گئی۔ بعض دفعہ ایک چنگاری نے چھپّر کو جلادیا، پھر اس سے کڑیوں میں آگ لگ گئی۔ پھر ہوا نے دوسرے گھروں تک آگ پہنچادی اور بستی جل گئی۔

کسبِ دنیا وحُبِّ دنیا کا فرق

صاحبو! جب حق تعالیٰ کے کلام سے سبب کفر معلوم ہوگیا تو اس کو خفیف نہ سمجھو اور اس کے ادنیٰ درجہ سے بھی نکلنے کی پوری کوشش کرو اور میں کسبِ دنیا سے

(۱) شیطان کا اصل مرض یہ تھا کہ اس نے تکبر کرکے یہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اور یہ مرض ہر مخلوق میں موجود ہے۔

منع نہیں کرتا بلکہ حُبِّ دنیا سے منع کرتا ہوں کیونکہ یہی جڑ ہے تمام جرائم کی ((حب الدنیا رأس کل خطیئة))(۱) آج کل نوتعلیم یافتہ جماعت کسبِ دنیا وحبِّ دنیا میں فرق نہیں کرتی جس کی وجہ سے وہ دوغلطیوں میں مبتلا ہیں۔

ایک تو علماء کے کلام میں دنیا کی مذمت دیکھ کر اُن پر طعن کرنے لگے کہ یہ لوگ کسبِ دُنیا سے منع کرتے ہیں حالانکہ نصوص شرعیہ میں اس کی اجازت صراحتاً موجود ہے (۲)۔ علماء اس کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ دوسرے جن نصوص میں کسبِ دنیا کی اجازت تھی ان کو ان ظالموں نے حب دنیا پر بھی محمول کرلیا حالانکہ جس پیغمبر کا یہ ارشاد ہے: ((کسب الحلال فریضة بعد فریضة))(۳) انہی کا یہ ارشاد ہے: ((حبّ الدنیا رأس کل خطیئة))(۴) اور یہ ارشاد بھی ہے: ((تعس عبدالدنیا تعس عبدالدرهم تعس بعدالخمیضة ان اعطی رضی وان منع سخط تعس وانتکس واذا شیك فلا انتقش)) ۔ اس میں حضور ﷺ نے بددعا دی ہے کہ دینار و درہم کا بندہ ہلاک ہوجائے ذلیل ہوجائے اور اگر اس کے کانٹا لگے تو خدا کرے نکلنا نصیب نہ ہو۔ شاید کوئی ذہین یہاں یہ اشکال پیدا کرے کہ حضور ﷺ کی بددُعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے پھر اس کا کیا ڈر؟ کیونکہ حضور ﷺ نے خود حق تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ: ((اللهم انما بشر فایما رجل اذیته او شتمة اولعنة فاجعلها لهٗ صلوٰة وزکوٰة وقربة تقربه بها الیك))(۴)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اُس بددُعا کا ہے جو حضور ﷺ نے بشریت کے اقتضاء سے غلبۂ غضب میں فرمادی ہو۔ تشریعی بددعا کا یہ حکم نہیں۔ اور اس جگہ

(۱) دنیا کی محبت ہر برائی کی اصل ہے (۲) قرآن وحدیث میں اس کی اجازت ہے (۳) حلال روزی کمانا فرائض کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے (۴) اے اللہ میں بھی انسان ہوں اگر میں کسی کے لئے بتقضاءِ بشریت کوئی کلمہ بددعا کا کہوں تو اس کو اس کے حق میں قربت کا ذریعہ بنادیجئے۔

جو((عبدالدنیا والدرھم)) ہم کو بددعا دی گئی ہے۔(۱) وہ بشریت کی راہ سے نہیں ہے بلکہ تشریعی بددعا ہے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب اس بددعا سے بہت ڈرنا چاہیئے کیونکہ حضور ﷺ کی دعا اور تشریعی بددُعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ((انی اری ربك یسارع فی ھواك)) کہ ''میں دیکھتی ہوں کہ جو آپ ﷺ چاہتے ہیں حق تعالیٰ ویسے ہی کر دیتے ہیں''

حب دنیا کی حقیقت

اب میں حُبِّ دنیا کی حقیقت حق تعالیٰ ہی کے کلام سے بتلانا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں بہت لوگ غلطی کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾(۲) سبحان اللہ! حق تعالیٰ کیسے رحیم ہیں کہ دنیا کی محبت سے بھی منع نہیں فرماتے بلکہ احبیت سے منع فرماتے ہیں کہ دنیا کی محبت اللہ ورسول ﷺ کی محبت سے زیادہ نہ ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ جہادِ فی سبیلہٖ میں کمی ہو جائے یعنی اطاعت احکام میں اختلال ہو جائے میرے نزدیک ﴿وجھاد فی سبیلہ﴾ تفسیر ہے ماقبل کی جس میں احبیت من اللّٰہ ورسولہ (۳) کی حقیقت بتلائی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ احبیت بھی مطلقاً موردِ ملامت نہیں (۴) اگر دنیا کی احبیت طبعی ہو تو مذموم نہیں بلکہ عقلی احبیت نہ ہونا چاہیے(۵) بلکہ یہ احبیت عقلیہ اللہ ورسول ﷺ کے ساتھ ہونا

(۱) دنیا اور مال کے طالب کو بددعاء دی گئی ہے وہ شرعی حکم کی حیثیت سے دی گئی ہے (۲) ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں'' سورۂ توبہ:۲۴ (۳) اللہ اور سول سے زیادہ محبوب ہونے کی حقیقت بیان کی گئی (۴) زیادہ محبوب ہونا بھی مطلقاً برا نہیں (۵) عقلاً اس سے زیادہ محبت نہ رکھے۔

چاہیئے اور احبیتِ عقلیہ کا معیار یہ ہے کہ اطاعتِ احکام و جہاد فی سبیلہ میں کمی نہ ہو۔ اگر یہ معیار محفوظ ہے تو پھر طبعی محبت اگر دنیا سے یا بیوی سے یا اولاد سے زیادہ بھی ہو تو کچھ ڈر نہیں۔

اگر ایک شخص اپنے بیٹے کے مرنے پر زیادہ روئے اور حضور ﷺ کی وفات کے واقعہ کو سن کر زیادہ نہ روئے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ مواخذہ اس پر ہوگا کہ تزاحم دین و دنیا کے موقع پر دنیا کو دین پر ترجیح دے(۱) اور اگر یہ نہ ہو بلکہ دنیا کی محبت و حرص کو دبا کر دین پر فدا کر دے۔ گو ترکِ دنیا سے حزن بھی (۲) ہو اور دل بھی دُکھے تو اس پر مواُخذہ تو کیا ہوتا اس سے تو ثواب بڑھے گا۔ کمال تقویٰ یہی ہے کہ دنیا کی حرص و محبت ہوتے ہوئے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن ست کہ از وحمام تقویٰ روشن ست (۳)

فرشتے اگر رشوت نہ لیں تو کیا کمال ہے، ان کو مال کی حرص ہی نہیں۔ کمال اُس سب جج کا ہے جس کے مدعی و مدعا علیہ دونوں نے الگ الگ سوا دو لاکھ روپے رشوت کے پیش کئے اور اُن سے ایک پیسہ نہ لیا اور غصے سے دونوں کو نکال دیا۔ مگر بے علمی کے سبب ایک جہالت بھی کی کہ آپ نے دونوں پر غصہ ظاہر کر کے مقدمہ کو ایسا خراب کر دیا کہ دونوں پر ظلم ہو گیا۔ ظالم پر بھی، مظلوم پر بھی۔ اور یہ بات اُن سے اول کہہ دی تھی کہ اگر تم رشوت پیش نہ کرتے تو میں مقدمہ کو انصاف سے فیصل کرتا۔ مگر اب چونکہ دونوں نے رشوت سے مجھے تکلیف دی ہے میں ایسا فیصلہ کروں گا کہ دونوں کو یاد رہے گا۔ یہ تو ان کی جہالت تھی مگر سوا دو لاکھ روپیہ کا

(۱) دین و دنیا کے ٹکراؤ کے وقت دنیا کو ترجیح دیگا تو پکڑ ہوگی (۲) دنیا چھوڑنے کا غم بھی ہو (۳) خواہشاتِ دنیا کی مثال اس ایندھن کی سی ہے جس سے تقویٰ کا حمام روشن کیا جاتا ہے۔

واپس کر دینا واقعی اس شخص کے حوصلہ کی بات تھی اگر وہ لے لیتا تو اس پر کیا جرم قائم ہوتا کچھ بھی نہیں کیونکہ ایک فریق رشوت دیتا دوسرا نہ دیتا جب تو یہ احتمال تھا کہ شاید دوسرا مخبری کر دے اور جب دونوں رشوت دے رہے تھے تو یہ احتمال بھی نہ تھا۔ اور کوئی مخبری کرتا بھی تو ثبوت کہاں سے لاتا کیونکہ رشوت کی رسید ہی نہیں ہوتی۔

ہدیہ یا رشوت

اس پر مجھے مولانا غوث علی صاحب پانی پتی کا لطیفہ یاد آیا کہ ایک شخص نے اپنے بھائی کے واسطہ سے مولانا کے پاس دس روپے ہدیہ بھیجے اور بھائی سے کہہ دیا کہ رسید لیتے آنا۔ شاید بھائی پر اطمینان نہ ہوگا۔ اس نے مولوی صاحب کو دس روپیہ دے کر کہا کہ ان کی رسید لکھ دیجئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اپنے روپے واپس لے جاؤ، کہیں رشوت کی بھی رسید ہوتی ہے۔ اس نے پوچھا حضرت! رشوت کیسی۔ یہ تو ہدیہ تھا۔ فرمایا کہ بلا غرض کسی کو کون دیتا ہے تم لوگ ہم کو صرف اس خوشامد میں دیتے ہو کہ دنیوی حاجات میں اللہ میاں سے کچھ سفارش کر دیں تو یہ رشوت ہوئی یا ہدیہ ہوا۔ اس میں لطافت تو تھی مگر یہ بھی بتلا دیا کہ ہدیہ وہ ہے جس میں سوائے تطییب قلب مہدی لہ (۱) کے اور کچھ مطلوب نہ ہو۔

حرص دنیا کا مذموم درجہ

میں کہہ رہا تھا کہ صرف حرصِ دنیا مطلوب نہیں بلکہ اس کے مقتضاء پر عمل کرنا مذموم ہے۔ غیر محقق شیخ اس میں غلطی کرے گا۔ اگر اس سے کوئی شخص حرصِ دنیا کی شکایت کرے گا تو وہ کوئی وظیفہ یا مراقبہ تجویز کر کے بتلا دے گا مگر محقق فوراً تسلی کر دے گا کہ حرص کا ہونا مضر نہیں بلکہ اس سے تو اجر بڑھتا ہے جب کہ عمل اس کے

(۱) ہدیہ اس کو کہتے ہیں کہ جس کو دیا جا رہا ہے صرف اس کی خوشی مطلوب ہو۔

خلاف ہو بلکہ شرعاً وہ حرص حرص ہی نہیں جس کے مقتضاء پر عمل نہ ہو۔ حرصِ شرعی وہی ہے جس سے دُنیا کو دین پر ترجیح ہونے لگے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی حقیقت کو خوب واضح فرمایا۔ جب آپ کے پاس خزائن کسریٰ فتح ہوکر آئے تو بڑا بھاری خزانہ تھا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہزاروں برس سے یہ سلطنت قائم تھی اور ابتداء سے اس وقت تک ایک ہی سلسلۂ خاندان میں چلی آرہی تھی۔ تو ایسی قدیم سلطنت کا خزانہ خود سمجھ لیجئے کہ کیا ہوگا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو دیکھ کر دُعا کی اور عرض کیا اے اللہ! ہم یہ تو دعا نہیں کرتے کہ ہم کو مال کی محبت نہ ہو اور نہ یہ عرض کرتے ہیں کہ اُس کے آنے کی ہم کو خوشی نہ ہو کیونکہ آپ کا ہی ارشاد ہے: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ﴾(۱)

جب آپ نے اس کو ہمارے لئے مزین کردیا ہے تو ہم کو اس سے محبت بھی ہوگی اور اس کے آنے سے خوشی بھی ہوگی۔ بلکہ ہم یہ دُعا کرتے ہیں کہ اس کی محبت کو اپنی رضا کا وسیلہ بنادے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو بات فرمائی ہے واقعی یہ وہی کہہ سکتے ہیں۔ غیر محقق مشائخ بلکہ محققین بھی بہت سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ جب مال مطلقاً مذموم ہے اور بعضے جاہل تو ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو کیا پرواہ ہے سلطنت کی، کیا پرواہ ہے روپیہ پیسہ کی اور بعضے جنت سے بھی استغناء ظاہر کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں اس وقت تک ہیں جب تک کھانے کو روٹی مل رہی ہے ورنہ حقیقت معلوم ہوجائے ان دعووں کی ۔ بس کمال وہ ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ظاہر

(۱) ''آراستہ اور خوشنما کردی گئی ہے لوگوں کے لئے محبت خواہشوں اور نفسوں کی آرزوں کی یعنی عورتیں، اور بیٹے، اور سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانوں کی اور خوبصورت اور فربہ گھوڑوں کی اور چوپاؤں اور مویشی کی اور کھیتی کی''۔ سورۂ ال عمران: ۱۴۔

فرمایا کہ مال کی احتیاج بھی ظاہر کی، اس سے مسرت بھی ظاہر کی مگر اس کے ساتھ یہ دُعا بھی کی کہ اے اللہ! اس کی محبت کو اپنی رضا کا ذریعہ بنا دیجئے۔

پس محبتِ مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ اس کا مطلوب بھی ہے۔ مثلاً اتنی محبت جس سے مال کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے مطلوب ہے کیونکہ مال کا ضائع کرنا حرام ہے۔ اگر اتنی محبت بھی نہ ہوگی تو یہ مال کی بے قدری کریگا اور اس کو ضائع و برباد کرے گا جس کی ممانعت اس حدیث میں آئی ہے۔((ان اللّٰہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال))(۱) اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کی محبت سے ہم کو انکار نہیں نہ یہ دعویٰ ہے کہ ہم کو اس کے آنے سے خوشی نہیں ہوتی۔ طبعاً محبت بھی ہے اور خوشی بھی ہے۔ مگر عملاً وعقلاً دعا یہ ہے کہ اس کو اپنی مرضیات کا وسیلہ بنا دیجئے۔

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معیار

اسی سے((لا یومن احدکم حتی یکون اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما)) کا بھی حل ہوگیا کہ مراد احبیتِ عقلیہ ہے جس کی تفسیر اوپر جہادِ فی سبیلہ میں گزر چکی ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حُبِّ عقلی سب سے زیادہ ہونی چاہئیے جس کا معیار یہ ہے کہ احکام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہو اور تعارض کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو دوسروں کے احکام پر ترجیح دی جائے۔ گو حبِّ طبعی میں کمی ہو۔ اور غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طبعی محبت ہی ہر شخص مسلم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ماں باپ واولاد وغیرہ سب سے ہی زیادہ ہے مگر اس کا ظہور خاص مواقع پر ہوتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زیادہ باتیں بنانے زیادہ سوال کرنے اور مال کو ضائع کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔

چنانچہ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو ایسا شبہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے اپنے والد کی محبت ہے مولانا نے اس وقت تو یہ جواب دیا کہ ہوگی۔ اس کے بعد عملاً اس شبہ کا یوں جواب دیا کہ باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور کمالات وفضائل بیان کرنا شروع کئے جس سے اہلِ مجلس بہت محظوظ ہورہے تھے اور وہ رئیس صاحب بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تو ہر مسلمان کو لذیذ معلوم ہوتا ہے اور جو جو ظالم کسی مسلمان کو یہ کہے کہ یہ ذکرِ رسول سے منع کرتے ہیں اس سے بڑھ کر مفتری کوئی نہیں۔ ارے! ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی منع نہیں کرتا، ہاں ضدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس طرح نہ ہو جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہو۔

جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب بہت مزے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سُن رہے ہیں تو درمیان میں دفعۃً فرمانے لگے کہ اچھا اس قصہ کو تو رہنے دیجیے، اب میں کچھ آپ کے والد صاحب کے کمالات ومحاسن بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے صاحبِ کمالات تھے۔ اس لفظ کے سنتے ہی رئیس کا رنگ بدل گیا اور کہا، مولانا توبہ توبہ! میرے والد بھی کوئی چیز ہیں جن کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو قطع کر کے کیا جائے۔ نہیں، آپ پہلا ہی بیان جاری رکھیئے۔ تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ کیوں ناگوار ہوا؟ آپ تو کہتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے والد کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ اب جو رئیس صاحب نے موازنہ کر کے غور کیا تو بے ساختہ کہنے لگے کہ مولانا! جزاکم اللہ تعالیٰ! آج آپ نے میرا شبہ حل کر دیا۔ واقعتاً مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ محبت زیادہ ہے اور والد کے ساتھ اس محبت کے مقابلہ میں کچھ بھی محبت نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقلی محبت مطلوب ہے

بہرحال طبعی محبت بھی ہر مسلمان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ طبعی محبت اگر کم بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ عقلی محبت سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونی چاہیئے کہ بدون اس کے صرف محبتِ طبعیہ بھی کافی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت تو زیادہ ہوتی ہے کہ آپ کی نعت میں قصیدے پڑھتے ہیں اور مولود کی مجالس قائم کرتے ہیں اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام وذکر سے مزا بھی آتا ہے مگر محبتِ عقلیہ سے کورے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں تو اُن کی حالت اچھی نہیں ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے۔

اور بعض لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبتِ عقلی تو ہوتی ہے کہ احکام کی مخالفت نہیں کرتے مگر محبتِ طبعی ان کو اپنے اندر کم معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ پریشان ہوتے ہیں۔ سو میں اُن کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اول تو ان کو محبت طبعی بھی حاصل ہے ورنہ اس کے فقدان کا رنج ہی کیوں ہوتا (۱) اور یہ فقدان کا گمان اس لئے ہوتا ہے کہ ابھی ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دوسری محبتوں سے موازنہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ موازنہ کے وقت معلوم ہوجائے گا کہ واقعی طبعی محبت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے جیسا کہ ان رئیس کے واقعہ میں ابھی میں نے بتلایا ہے۔ دوسرے یہ کہ طبعی محبت معلوم نہیں تو غیر مطلوب میں کمی ہونا کچھ مضر نہیں۔ ضرر تو یہ ہے (۲) کہ محبتِ مطلوبہ میں کمی ہو یعنی محبتِ عقلیہ میں، اور تم بحمداللہ تعالیٰ اس سے محفوظ ہو پھر کیوں پریشان ہوتے ہو۔

---

(۱) اس کے نہ ہونے کا غم ہی کیوں ہوتا (۲) نقصان تو یہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف طبعی محبت ہونا کافی نہیں

اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو محض محبت طبعیہ کو کافی سمجھے ہوئے ہیں چنانچہ بریلی میں ایک دفعہ بعد نمازِ جمعہ میرا بیان ہوا جس میں ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾(۱) کا بیان تھا اور تکمیلِ ایمان کی تاکید اور اہل کمال کی صحبت اختیار کرنے کی ترغیب تھی۔ مگر رات کو اسی جگہ اس کے خلاف بیان ہوا اور یہ کہا گیا کہ اے لوگو! تقویٰ کی ضرورت نہیں نہ نماز روزہ کی ضرورت ہے صرف محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہے پھر چاہیے پیئو چاہے کچھ کرو تم ضرور جنت میں جاؤ گے اور یہ وہابڑے ہرگز ناجی نہیں۔

ان لوگوں نے میرے جلانے کو یہ بیان کیا تھا مگر احمقوں نے میرے جلانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ اطہر کو ایذاء دی۔(۲) بھلا مجھے اس سے جلنے کی کیا ضرورت تھی اگر جلیں گے تو وہی جہنم میں جلیں گے۔ میں نے جو مضمون بیان کیا تھا اپنی طرف سے نہیں بیان کیا تھا بلکہ قرآن وحدیث سے بیان کیا تھا اُس کی مخالفت کرنے سے میرا کیا نقصان ہوا۔ اگر نقصان ہوا تو انہی کا ہوا۔

ایک شبہ کا ازالہ

پس یہ حالت البتہ افسوسناک ہے کہ محض محبت کا نام یاد کرلیا اور اطاعت(۳) کا وقت آیا تو احکامِ نبویہ کی صریح مخالفت کرنے لگے۔ غرض جو شخص احکام کا مطیع ہو اس کو محبتِ مقصودہ حاصل ہے۔ اب اگر بعض آثار میں کمی بھی ہو تو پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ بعض لوگوں کو اپنی نسبت محبت نہ ہونے کا ایک اور واقعہ سے بھی

(۱) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور نیک لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ سورۂ: (۲) پاکیزہ روح کو تکلیف دی (۳) فرمانبردار۔

وہم ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کو حضور ﷺ کی طرف زیادہ کشش نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف کشش زیادہ ہوتی ہے اور بعض کو اس کے برعکس حالت سے خدا تعالیٰ کی محبت نہ ہونے کا وہم ہوجاتا ہے۔ سو یاد رکھو کہ یہ محض محبت طبعیہ کی کیفیات میں تفاوت ہے (۱) اور محبتِ عقلیہ اللہ ورسول ﷺ دونوں کی دونوں شخصوں کو حاصل ہے یعنی جس کو اللہ تعالیٰ کی کشش زیادہ ہے اور رسول ﷺ کی طرف کم اور اس کو بھی جس کو حضور ﷺ کی طرف کشش زیادہ ہے اور اللہ کی طرف کم، اور یہ دھوکا حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کو بھی ہوا تھا انہوں نے بھی محبتِ طبعیہ وعقلیہ کے فرق کی طرف التفات نہیں کیا تھا۔ (۲)

اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ انہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا تو خجلت کی وجہ سے (۳) آنکھیں نیچی کرلیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے میرے دل پر اتنا غلبہ کیا ہے کہ آپ کی محبت کی بھی جگہ نہیں چھوڑی۔ حضور ﷺ نے ان کی تسلی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اے رابعہ! خدا تعالیٰ سے محبت کرنا عین میرے ساتھ محبت کرنا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا آپ ﷺ نے حکم دیا ہے تو اس میں حکمِ رسول ہی کی اطاعت ہے اور یہی محبت عقلیہ ہے۔

ترتیب بیان

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن سے کفر کا سبب دو امر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک غفلت عن الآخرت، دوسرے حُبّ دنیا۔ (۴) پھر اس پر میں نے یہ کہا تھا کہ میں

(۱) کیفیات کا فرق ہے (۲) محبت طبعی اور عقلی کے فرق کی طرف توجہ نہ ہوئی (۳) شرمندگی (۴) قرآن سے انکار کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں ایک آخرت سے غفلت دوسرے دنیا کی محبت۔

کسبِ دُنیا سے منع نہیں کرتا بلکہ حُبِّ دنیا سے منع کرتا ہوں۔ پھر ترقی کر کے یہ کہا تھا کہ مطلقاً محبتِ دُنیا سے بھی منع نہیں کرتا بلکہ احبیتِ دنیا سے منع کرتا ہوں۔ پھر اور ترقی کر کے کہا تھا کہ احبیتِ دُنیا سے بھی مطلقاً منع نہیں کرتا بلکہ احبیتِ عقلیہ سے منع کرنا ہوں۔ (۱) اگرچہ طبعاً کسی کو دُنیا سے زیادہ محبت ہو تو کچھ حرج نہیں مگر عقلاً ایسا نہ ہونا چاہیے۔ اس پر محبتِ طبعیہ وعقلیہ کی حقیقت بیان کرنے میں کلام طویل ہوگیا۔

بہرحال حُبِّ دنیا اور انہماک فی الدنیا سبب ہوا ہے اہلِ کفر کے کفر کا (۲) یہود اسی واسطے ایمان نہ لاسکے کہ ان کو اندیشہ تھا کہ اب تو ہم پیر بنے ہوئے ہیں مسلمان ہوکر مرید ہوجائیں گے اور یہ ہدایا ونذرانے جو اب ملتے ہیں بند ہوجائیں گے۔ حالانکہ حضور ﷺ کے مریدوں کو بعد میں اتنا کچھ ملا کہ ان پیروں کے باپ دادا کے خواب میں بھی نہ آیا ہوگا۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کسریٰ وقیصر کے خزائن فتح کئے اور دنیا ان کے پیروں کی غلام باندی ہوگی تو جس دنیا کی محبت نے ان کافروں کو ایمان سے روکا وہ بھی ایمان کی بدولت ان کو پہلے سے زیادہ مل جاتی۔ اور نہ بھی ملتی تو اُن سے خدا تعالیٰ تو راضی ہوجاتے اور رضائے الٰہی وہ چیز ہے جس کے سامنے ساری دنیا کی بھی کوئی ہستی نہیں مگر اس کو تو وہ سمجھے جس کو آخرت کی فکر ہو۔ خیر کفار تو رضائے الٰہی کی اس لئے قدر نہ کرسکے کہ وہ آخرت سے غافل اور منکر تھے مگر ہم مسلمانوں کو کیا ہوگیا کہ باوجود اعتقادِ آخرت کے پھر دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں اور رضائے الٰہی کی بے قدری کرتے ہیں۔

اس وقت اس بیان کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بیان مستورات کی فرمائش سے ہورہا ہے۔

(۱) بلکہ عقلاً محبت میں زیادتی کو منع کرتا ہوں (۲) کفر کا سبب دنیا کی محبت اور دنیا میں منہمک ہونا ہے۔

عورتوں پر حُبِّ دنیا کا غلبہ

عورتوں پر حُبِّ دنیا کا بہت غلبہ ہے ان میں زیور اور کپڑے کی حرص بہت زیادہ ہے۔ پھر حالت یہ ہے کہ جب چار عورتیں جمع ہوکر بیٹھیں گی تو صبح سے شام تک دنیا ہی کا چرچا رہے گا دین کا ذکر ہی نہیں آتا۔ عورتیں خود غور کر کے دیکھ لیں گے کہ ان کی مجلسوں میں سے کتنی مجلسیں ایسی ہیں جن میں دین کا ذکر ہوتا ہو۔ اور گو دنیا کا زیادہ تذکرہ کرنا بھی مباح(۱) ہے جب کہ کوئی بات معصیت کی نہ کی جائے مگر اس مباح کی سرحد گناہ سے ملی ہوئی ہے جو شخص زیادہ مشغلہ دنیا کے تذکرہ کا رکھے گا وہ ضرور گناہ میں مبتلا ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے: ((الا ان کل ملك حمی وان حمی اللّٰہ محارمہ ومن رتع حول الحمی یوشك ان یقع فیہ))(۲) اور بزرگوں کا ارشاد ہے کہ مباحات بھی ''حول الحمی'' میں داخل ہیں(۳) چنانچہ تجربہ بھی ہے۔ اس لئے مسلمان کو چاہیئے کہ زیادہ تر طاعات میں مشغول رہے مباحات میں بھی زیادہ انہماک نہ کرے۔ اس لئے دنیا کا زیادہ تذکرہ کرنا کہ ساری مجلس میں اول سے آخر تک یہی ذکر ہو مقدمۂ معصیت ضرور ہے۔(۴) اور اس کا منشا وہی حبِّ دنیا ہے جو آج کل عورتوں میں غالب ہے اسی لئے عورتیں بہت کم دیندار ہوتی ہیں اور جن مقامات کی عورتوں میں دینداری ہے وہ صرف اسی وجہ سے کہ ان میں حبِّ دُنیا کم ہے۔

(۱) جائز ہے (۲) ہر بادشاہ کی کچھ چراگاہیں ہوتی ہیں اللہ کی چراگاہیں اس کی حرام کردہ اشیاء ہیں جو ان کے قریب جائے گا اندیشہ ہے کہ ان میں مبتلا ہوجائے (۳) جائز چیزیں بھی چراگاہوں کے ارد گرد میں شامل ہیں (۴) گناہ کا مقدمہ ضرور ہے۔

پانی پت کی عورتوں کی خوبی

ہمارے قُرب میں پانی پت کی عورتیں بہت دیندار سُنی جاتی ہیں۔ اُن میں بعض لڑکیاں قرآن کی حافظ ہیں اور بعضی سبعۂ قراءات کی ماہر ہیں اور قرآن پڑھی ہوئی تو قریب قریب سب ہی ہیں۔ نمازی بھی بہت زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ دنیا کے اعتبار سے بھی خوشحال ہیں۔ ہر شخص کے یہاں تھوڑی بہت زمین ضرور ہے۔ کھانے پینے کی طرف سے سب بے فکر ہیں مگر یہ خوشحالی اسی بات کی بدولت ہے کہ ان میں دنیا کی حرص زیادہ نہیں۔ وہاں کی مستورات جہاں تک سنا گیا ہے بہت سادگی سے رہتی ہیں یہاں تک کہ ان کی دلہنیں بھی گیروں (۱) کے کپڑے پہن لیتی ہیں اور قیمتی کپڑوں کی زیادہ حرص نہیں کرتیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ساری زمینداری زیور اور کپڑوں ہی میں نیلام ہوجاتی۔ چنانچہ جن قصبات کی عورتوں پر یہ مرض ہے وہاں افلاس آچکا ہے۔ گھر اور زمین تک بنیئے کے پاس رہن ہوچکا ہے۔ بھلا ایسے زیور اور کپڑے سے کیا خوشی ہو جس کے بعد گھر ہی برباد ہوجائے۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ چاہے کھانے کو گھر میں کچھ بھی نہ ہو مگر برادری میں نکلنے کے لئے اطلس اور کمخواب کے کپڑے اور سونے کا زیور ضرور ہوتا کہ برادری میں عزت کی نظر سے دیکھی جائیں حالانکہ غریب آدمی قیمتی کپڑے پہن کر کچھ معزز نہیں ہوسکتا کیونکہ حقیقتِ حال سب کو معلوم ہے۔

دکھاوے کے لئے عمدہ لباس پہننے سے عزت نہیں ہوتی

کانپور میں ایک صاحب مجھ سے ملے جو لیسدار مفرق ٹوپی (۲) پہنے ہوئے تھے اور باقی لباس بھی نہایت شان دار تھا میں سمجھا کہ شاید کوئی نواب یا بڑے

(۱) پیلے رنگ کے سادہ کھدر کے کپڑے (۲) گوٹا وغیرہ لگی ہوئی خوبصورت ٹوپی پہن رکھی تھی۔

درجہ کا رئیس ہوگا بعد میں معلوم ہوا کہ میاں غالباً کانسٹیبل ہیں اور کل دس بارہ روپیہ تنخواہ ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تنخواہ معلوم ہوتے ہی وہ شخص میری نظروں سے گر گیا اور وہی لباس جس کی وجہ سے پہلے کچھ وقعت ہوئی تھی اس کی ذلّت کا سبب بن گیا اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کو اہلِ دنیا بھی محسوس کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک موقع پر ایک غریب آدمی بڑی شان وشوکت کا لباس پہن کر کلکٹر کے پاس ملازمت کی تلاش کو گئے اور ایک رئیس کو سفارش کے لئے ساتھ لے گئے۔ کلکٹر کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ لیاقت (۱) کچھ بھی نہیں۔ اُس نے صاف کہا کہ بڑی نوکری کی لیاقت نہیں اور چھوٹی نوکری ان کی شان کے خلاف ہے اس لئے نہایت حقارت کے ساتھ جواب دے کر نکال دیا۔

عزت لباس سے نہیں ہنر سے ہوتی ہے

افسوس ان لوگوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ جس چیز کے لئے یہ اپنی زمین اور جائیداد کو برباد کرتے ہیں وہ اس کو کھوکر حاصل نہیں ہوسکتی۔ زمیندار خوشحال آدمی چاہے کیسے ہی معمولی لباس میں ہو اس کی عزت ہوتی ہے اور زمین وجائیداد کھوکر چاہے کوئی کتنا ہی قیمتی لباس پہن لے اس کی عزت نہیں ہوتی۔ ہاں! اگر کوئی دوسرا عزت کا سبب پیدا ہوجائے تو اور بات ہے مثلاً ملازمت بڑے عہدہ کی مل جائے یا اس کو کوئی کمال حاصل ہوجائے۔ مگر مسلمانوں کو آج کل ملازمت کا ملنا تو شرائطِ ملازمت حاصل نہ کرنے سے دشوار ہوگیا اور کوئی کمال بھی حاصل نہیں کرتے۔ پھر محض لباس سے عزت کیونکر ہوسکتی ہے اور ملازمت کسی کو ملتی بھی ہے تو وہ اس میں بھی ذلّت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ نوکری تو میاں کی پچاس روپیہ کی اور

(۱) قابلیت۔

شان بناتے ہیں پانچ سو روپیہ کے ملازم کی سی اور اگر کہیں تنخواہ کی قلت کی قلعی کھل جائے تو اس پر دوسری قلعی چڑھا کر حقیقت کو چھپایا جاتا ہے۔

چنانچہ عورتوں کی ایک کمیٹی میں اپنے اپنے شوہروں کی تنخواہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ میرے میاں کی تنخواہ سو ہے کسی نے کہا دو سو ہے۔ ایک غریب عورت بھی وہاں موجود تھی جو زیور اور لباس میں کسی سے کم نہ تھی۔ اُس سے جو پوچھا تیرے میاں کی تنخواہ کیا ہے؟ تو وہ یہ کہتے ہوئے شرمائی کہ بیس روپیہ ہے اور جھوٹ بولنے میں بھی رسوائی کا اندیشہ ہوا۔ تو آپ کیا کہتی ہیں کہ تنخواہ تو بیس ہی روپیہ ہے مگر ماشاء اللہ اوپر کی آمدنی بہت ہے۔ ایک عورت نے کہا، کم بخت توبہ کر، حرام کی آمدنی پر ماشاء اللہ کہتی ہے۔ کفر ہو جائے گا۔ ایمان جاتا رہے گا۔

تفکّر کی ضرورت

میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ دنیا کے طالب اور اس میں منہمک ہیں وہ اس کی صحیح حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ حقیقت معلوم نہ ہونے سے ہی اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے پاخانہ پر چاندی کے ورق لگے ہوئے ہیں اور کوئی اس کو حلوا سمجھ کر تاک میں بیٹھا ہو یا کسی چڑیل بڑھیا کو لال ریشمی لباس پہنا دیا گیا ہو اور نقاب سے منہ ڈھانک دیا گیا ہو اور کوئی اس کو حسین خوبصورت سمجھ کر محبت کا دم بھرنے لگے۔ مگر جب بُرقع اُٹھے گا اس وقت اس محبت کی حقیقت معلوم ہو جائیگی ؎

پس قامت خوش کہ زیر چادر باشد
چون بازکنی مادر مادر باشد (۱)

(۱) چادر کے اندر جو ایک خوشنما قد و قامت معلوم ہوتا تھا جیسے ہی چادر اتری تو معلوم ہوا کہ ماں کے برابر بوڑھی عورت تھی۔

کسی کا قطعہ ہے ؎

عارفے خواب رفت در فکرے دیدِ دنیا بصورتِ بکرے
کرد ازوے سوال کاے دلبر بکر چونی بایں ہمہ شوہر
گفت یک حرف باتو گویم راست کہ مرا ہر کہ بود مرد نخواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

یعنی ایک عارف نے دُنیا کو خواب میں دیکھا کہ بڑھیا ہے مگر ابھی تک باکرہ(۱)۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تو نے اتنے خصم (۲) کئے اور اب تک کنواری ہی رہی۔ کہا جو مرد تھے انہوں نے مجھے منہ نہیں لگایا اور جو میرے عاشق تھے وہ نامرد تھے ان کو میں نے منہ نہیں لگایا اس لئے اب تک کنواری ہی ہوں۔ واقعی دنیا تو اس وقت بوڑھی ہوگی جوان کہاں سے رہی۔ ہزاروں برس کی عمر ہوچکی ہے مگر ہم لوگ اس پر جان دے رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی حسین نوجوان ہے۔

صاحبو! آپ تو دُنیا کو بُرقع کے اوپر سے دیکھ کر اس کے عاشق ہوگئے ہو اور اہل اللہ نے بُرقع اُٹھا کر اسے دیکھا ہے اس لئے وہ نفرت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک تفسیر ہے اس آیت کی: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ کہ دنیا وآخرت کی حقیقت میں تفکر کرو۔ دونوں کو بُرقع کھول کر دیکھو تو تم کو دنیا سے نفرت اور آخرت کی طلب ہوجائے گی۔ دنیا ظاہر میں محاسن سے مزّین ہے مگر اندر گوہ موت اور سانپ بچھو بھرے ہوئے ہیں اور آخرت ظاہر میں مکارہ و مصائب سے (۳) گھری ہوئی ہے مگر اندر سے نہایت حسین دلفریب محبوبہ ہے۔ جس کی ایک

(۱) کنواری ہے (۲) شوہر کئے (۳) ظاہری طور پر مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھری ہوئی ہے۔

نگاہ کے سامنے سلطنتِ ہفت اقلیم بھی کوئی چیز نہیں۔(۱) ہم کو الزام دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واللہ! ہم تم سے زیادہ دنیا سے واقف ہیں کیونکہ ہم کو تو تفکر فی الدنیّا کا امر ہے۔ ہم تو اس میں خوب غور و تامل کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کی حقیقت سے بھی واقف ہو گئے۔ تم خاک واقف ہو کہ محض برقع کے اوپر سے زینت دیکھ کر عشق کا دم بھرنے لگے۔

پس ہم دنیا سے بے توجہی کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ دُنیا کی حالت پر ضرور توجہ کرو مگر کامل توجہ کرو جس سے حقیقت منکشف ہو۔ ناتمام توجہ نہ کرو کہ ظاہری تک رہ جاؤ چنانچہ اس آیت میں سببِ کفر یہی بتلایا ہے۔ ﴿یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ کہ کفار کو دنیا کی صرف ظاہری حالت کا علم ہے اس لئے وہ ایمان سے رکے ہوئے ہیں یعنی اگر حقیقتِ دنیا کا علم ہو جاتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ تو یہاں بھی ظاہر دنیا کے علم کو مذموم کہا گیا ہے۔ حقیقت کے علم کو مذموم نہیں کہا گیا۔ اور حقیقتِ دنیا کا علم اہلِ دنیا کو حاصل نہیں صرف اہلِ دین ہی کو حاصل ہے۔

ترقی مطلوب

اور یہ مضمون اُس مضمون کی نظیر ہے جو میں نے لکھنؤ کے ایک وعظ میں بیان کیا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ علماء ترقی سے منع کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اور ہم پر بہتان ہے۔ ہم ترقی سے کیونکر منع کر سکتے جب کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے ہم کو ترقی کا حکم فرمایا ہے۔

چنانچہ اِرشاد ہے۔ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰت﴾ کہ خیر میں باہم سبقت کرو۔ اور یہی ترقی کا حاصل ہے۔ پس ترقی تو ہمارے نزدیک فرض ہے۔ اور اس سے معلوم

(۱) ساتوں زمینوں کی بادشاہت کی بھی کوئی قیمت نہیں۔

ہوا ہوگا کہ علماء تم سے زیادہ ترقی کے حامی ہیں کیونکہ تم نے آج تک اس کو فرضِ شرعی نہ کہا تھا نہ اس کی فرضیت کو قرآن سے ثابت کیا بلکہ تم محض اقتصادی اور تمدّنی مصالح کی بناء پر اس کے حامی ہو۔ پس ترقی کے ضروری ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہ رہا صرف اختلاف اس بات میں ہے کہ ہم ترقی کے لئے اتنی قید بڑھاتے ہیں کہ خیر میں ترقی ہونی چاہیئے اور آپ یہ قید نہیں بڑھاتے، مگر اس قید کے ضروری ہونے سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔

اوّل تو یہ قید خود نص میں موجود ہے یعنی ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰت﴾(۱)۔ دوسری خیر کا مقابل شر ہے اور ترقی فی الشر کو کوئی (۲) عاقل مطلوب نہیں کہہ سکتا۔ اب اختلاف صرف اس میں رہا کہ جس ترقی کے آپ حامی ہیں وہ خیر ہے یا نہیں؟ آپ ترقی درہم کے حامی ہیں خواہ دین سلامت رہے یا نہ رہے اور ہم بدون سلامت دین کے ترقی درہم کو ترقی ورم سمجھتے ہیں۔ (۳) جس شخص کے بدن پر ورم ہوجائے ظاہر میں وہ بھی ترقی یافتہ ہے مگر حقیقت میں وہ تنزل کی طرف جارہا ہے۔ یہی حال بدون دین کے ترقی ورم کا ہے۔ پس یوں نہ کہو کہ علماء ترقی سے مانع ہیں بلکہ یوں کہو کہ وہ خاص صورت کی ترقی کے مانع ہیں جو ترقی ورم کے مشابہ ہے ورنہ فی نفسہٖ مطلق ترقی کے تو وہ تم سے زیادہ حامی ہیں۔

تفکر فی الدنیا

اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ ہم توجہ الی الدنیا سے (۴) منع نہیں کرتے بلکہ دنیا کی طرف ناتمام توجہ سے منع کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی حالت

(۱) خیر یعنی اچھی باتوں میں ترقی کرو (۲) برائی میں ترقی کو کوئی پسند نہیں کرتا (۳) ایسی ترقی جس میں دین سلامت نہ رہے اسکی مثال جسم پر ورم کی مانند ہے کہ اگرچہ جسمی ترقی ہوئی لیکن وہ مطلوب نہیں (۴) دنیا کی طرف متوجہ ہونے کو منع نہیں کرتے۔

میں کامل توجہ کرو۔ جس سے اس کی حقیقت واضح ہوجائے اور ہم توجہ الی الدنیا سے کیونکر منع کرسکتے ہیں جب کہ نص میں تفکر فی الدنیا کا امر ہے۔ چنانچہ اہل اللہ نے دنیا کی حالت میں کامل توجہ کی ہے اور اس کی حقیت سمجھ کر اس کو بتلایا۔

چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے: ((حلالها حساب وحرامها عذاب)) کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کا حلال حصہ تو حساب سے خالی نہیں اور حرام پر عذاب ہوگا۔ تو کوئی جز وکلفت (۱) سے خالی نہ ہوا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں ماکولات ومشروبات و ملبوسات ونساء میں منحصر ہیں۔ اور ماکولات میں سب سے افضل شہد ہے اور وہ ایک مکھی کی قے ہے اور مشروبات میں سب سے افضل پانی ہے جس میں خنزیر تک بھی آدمی کا شریک ہے اور ملبوسات میں سب سے بہتر حریر ہے جو ایک جانور کا لُعاب ہے۔ اور نساء کی یہ کیفیت ہے کہ ((ترهن لاحسن مواضعها ويقعد منها انتن مواضعها))(۲) یہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے سے دنیا کی حقیقت دوسروں پر بھی واضح ہوتی ہے۔

اور ایک بزرگ کا ارشاد امامِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں تو قابلِ نفرت ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ خود اپنی حالتِ ذاتیہ پر نظر کرکے بھی قابلِ نفرت ہے کیونکہ طالبِ دنیا کوئی راحت میں نہیں ہے۔

دنیا دار پریشانی سے خالی نہیں

صاحبو! تم دنیا داروں کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو نہ دیکھو بلکہ ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس رہ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھی پریشانی سے خالی نہیں اور طالبِ آخرت سب کے سب راحت میں ہیں چنانچہ ان کی یہ حالت ہے ؎

(۱) پریشانی (۲) یہ مضمون نساء کے متعلق مستورات کے حاضر ہونے کے سبب بیان نہ کیا تھا (۳) تم ان کی بہترین جگہ کو دیکھتے ہو اور ان کی بدترین جگہ میں بیٹھتے ہو۔

نہ برشتر سوارم نہ چواشتر زیر بارم نہ خداوندِ رعیت نہ غلامِ شہریارم(۱)

دنیا والوں کو کہیں بچہ کا غم ہے کہیں بیوی کا کہیں تنگدستی کا کہیں مقدمہ بازی کا کہیں زمینداری کا کہیں شادی اور غمی کی رسموں کا۔ اور اہل اللہ کو کچھ بھی غم نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو بیوی بچہ کا یا تنگدستی کا حادثہ پیش نہیں آتا۔ ان کو بھی یہ واقعات پیش آتے ہین اور ان کے منہ سے بھی آہ نکلتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اندر سے خوش بھی ہوتے ہیں۔ شاید تم کہو کہ یہ دونوں باتیں کیونکر جمع ہوسکتی ہیں تو میں کہونگا کہ ان دونوں باتوں کو تو ایک معمولی مریض شفاخانہ میں جمع کرکے دکھلا دیتا ہے کسی مریض کے دل ہو(۲) اور ڈاکٹر کسی مصلحت سے بغیر کلورافارم سنگھائے اس کا آپریشن کرے تو وہ اس وقت روئے گا بھی، چلائے گا بھی، آہ بھی کرے گا مگر بعد میں ڈاکٹر کو پچاس روپیہ نذرانہ اور انعام کے بھی دے گا۔

تو دیکھیے! اس شخص نے آہ بھی کی اور رویا چلایا بھی اور دل سے ان سب باتوں پر خوش بھی تھا جبھی تو ڈاکٹر کو فیس اور انعام دیا۔ اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے۔ یہ زندہ مثال ہے تکلیفِ ظاہری اور محبت حق کے جمع ہوجانے کی، محقق دونوں کو جمع کرکے دکھلا دیتا ہے اور بیچارہ غیر محقق ایسے موقع پر گھبرا کر یوں کہنے لگتا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش(۳)

یہ شعر اصل میں ایک عربی شعر کا ترجمہ ہے ؎

القاء فی الیم مثکوفا وقال له ایاك ایاك ان تبتل بالمأ

(۱) نہ میں اونٹ پر سوار ہون اور نہ اونٹ کی طرہ لدا ہوا ہون اور نہ رعیت والا ہوں اور نہ بادشاہ کا غلام ہوں (۲) پھوڑا (۳) میرے ہاتھ پیر باندھ کر تختہ پر ڈال کر دریا کے بیچ میں چھوڑ دیا اور پھر کہتے ہو کہ خیال کرنا کپڑے نہ بھیگ جائیں۔

علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت حق سبحانہ کی شان میں اس شعر کا پڑھنا حرام ہے کیونکہ حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے جیسا اس شعر میں تکلیف مالا یطاق کا الزام دیا گیا ہے اور محقق جو تکلیف و رضا کو جمع کر لیتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عقلاً خوش ہوتا ہے اور طبعاً متالم ہوتا ہے(۱)۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود برجانِ من دل فدائے یار دل رنجانِ من (۲)

تکلیف کی بات سے طبعاً تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر عقلاً اس وجہ سے کہ:

ع ہر چہ از دوست می رسد نیکوست (۳) شیریں ہوجاتی ہے پس یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ طالبانِ دنیا پریشانی میں ہیں اور طالبانِ آخرت راحت میں ہیں۔

مطلوبیت دنیا کے درجات

صاحبو! تم بھی ان حضرات کی طرح باطن دنیا میں تامل کرو۔ اس آیت میں بھی ظاہر کی قید بڑھا کر باطن پر نظر کرنے کی طرف اشارہ ہے اور خلاصہ اس نظرِ باطن کا یہ ہے کہ دنیا میں اس کو مطلوبیت کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مطلوبیت اس کے صفات کے اعتبار سے، دوسرے مطلوبیت اس کی غایت کے اعتبار سے۔ توصف (۴) کے اعتبار سے تو دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ فانی ہے اور آخرت باقی ہے اور پائیدار کے مقابلہ میں ناپائیدار قابل رغبت نہیں ہوا کرتا (۵)۔ اور غایت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کے لئے لوگ دنیا کو طلب کرتے

(۱) وہ طبعی طور پر پریشان ہوتا ہے (۲) جس چیز سے میرا محبوب خوش ہو مجھے وہی پسند ہے میرا دل میرے محبوب پر فدا ہے (۳) دوست کی جانب سے جو بات بھی پیش آئے مجھے اچھی لگتی ہے (۴) صفات کے اعتبار سے تو دنیا کا یہ حال ہے کہ وہ ختم ہونے والی ہے (۵) التفات کے قابل نہیں ہوتا۔

ہیں وہ بھی دنیا سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ وہ بھی دین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

راحت وآرام کی حقیقت

اب سمجھیئے کہ دنیا کو کس چیز کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عیش وآرام کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ عیش وآرام کس چیز کا نام ہے بعض لوگ عمدہ لباس عمدہ مکان اور عمدہ غذا کو عیش وآرام سمجھتے ہیں مگر یہ تو اسبابِ آرام ہیں اور عیش وآرام کی حقیقت کچھ اور ہے۔

دیکھئے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہوجائے اور یہ سب اسباب بھی اس کو میسر ہوں تو کیا اس کو ان اسباب سے کچھ خوشی ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر کسی بے آئین سلطنت میں اس کو اجازت دی جائے کہ چاہے تم اپنا کوئی عوض پھانسی کے لئے دے دو خواہ خود پھانسی پر لٹک جاؤ۔ اور یہ شخص اعلان کردے کہ جو شخص میری طرف سے پھانسی پر لٹکنا منظور کرے میں اس کو اپنی تمام جائیداد اور مال دیدوں گا۔ تو بتلاؤ کیا کوئی غریب سے غریب بھی پھانسی کو گوارا کرلے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں کرے گا۔

پس معلوم ہوا کہ یہ اسباب حقیقتِ دنیا نہیں بلکہ صورتِ دنیا ہے اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی راحتِ قلب۔ اور ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ راحتِ قلب طلبِ دین ہی سے حاصل ہوتی ہے، طلبِ دنیا سے حاصل نہیں ہوتی۔ اہل اللہ میں جو حضرات محبوبانہ شان میں رکھے جاتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے شاہانہ لباس وغذا سے اور کثرتِ معتقدین سے نوازا ہے میں انکا ذکر نہیں کرتا بلکہ جن دینداروں کی یہ حالت ہے کہ مدفوع علی الابواب ہیں (۱)۔ جوتے بھی درست نہیں لباس بھی شکستہ ہے۔ میں ان کی نسبت دعوی سے کہتا ہوں کہ وہ بھی راحتِ قلب میں دنیا داروں

(۱) دروازوں سے دھکے دیئے جاتے ہیں۔

سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہے کہ ((رب اشعث اغبر مدفوع علی الابواب لواقسم علی اللّٰہ لا برہ)) ان کو خدا پر ایسا ناز ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں کہ یہ اس طرح ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں اسی کو عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم (۱)

وہ اپنی ایسی حالتِ شکستگی میں خوش اور مگن ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی فقر و فاقہ کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ تم اس دولت کی قدر کیا جانو۔ تم کو مفت میں یہ دولت مل گئی ہے۔ اس کی قدر ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھو جس نے سلطنت کو چھوڑ کر فقر و فاقہ خریدا ہے۔ وہ دنیا کی تکالیف کو تکلیف ہی نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود برجانِ من دل فدائے یار دل رنجانِ من (۲)

دیکھیے! سب سے بڑی کلفت دنیا میں موت کی ہے مگر وہ اس کے عاشق ہیں۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خرم آن روز کزیں منزل ویران بردم راحتِ جاں طلبم وز پے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسرایں غمِ روزے تا درمکیدہ شاداں وغزل خواں بردم (۳)

اب بتلائیے جو موت سے بھی ایسا خوش ہو وہ دوسری کسی کلفت سے کیا پریشان ہوگا۔ پھر یہ محض باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی

(۱) میکدہ کا فقیر ہوں لیکن مستی کی حالت میں آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکم چلاتا ہوں (۲) ایسی ناپسندیدہ بات جس سے تو خوش ہو مجھے وہی پسند ہے کیونکہ میرا دل تجھ پر قربان ہے (۳) وہ کتنا پیارا دن ہوگا جب مجھے قبرستان لے جایا جارہا ہوگا میں وہاں کی راحت طلب کروں گا اور محبوب کے در کی طرف جارہا ہوں گا میں نے یہ نذر مانی ہے کہ جب یہ مبارک دن آئے گا تو خوش خوش غزل گاتا جاؤں گا۔

موت کے وقت ان کی حالت یہی ہوتی ہے۔ایک بزرگ جونقشبندی ہیں جن پر سکون غالب ہوتا ہے چشتی بھی نہ تھے کہ مغلوب ہوں انہوں نے مرتے ہوئے یہ وصیت کی کہ ہمارے جنازہ کے ساتھ ایک خوش آواز یہ قطعہ پڑھتا ہوا چلے ؎

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو ۔۔۔ شیأً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانبِ زنبیل ما ۔۔۔ آفرین بر دست و بر باز روئے تو (۱)

اگر کوئی چشتی ایسی وصیت کرتا تو غلبہ کی تاویل بھی ہوسکتی تھی کیونکہ سوختن افروختن (۲) انکا حصہ ہے۔

اہل اللہ موت سے نہیں گھبراتے

مگر حق یہ ہے کہ اس بات میں اہل اللہ سب ہی کا یہی مذاق ہے کہ وہ موت سے نہیں گھبراتے۔آخر کچھ تو بے فکری تھی جو ایسی وصیت سوجھی۔شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مرنے کے بعد ان کو کسی کے شعر پڑھنے سے کیا مزہ آیا ہوگا تو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مرنے کے بعد بھی مزہ آتا ہے۔

چنانچہ حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جنازہ کے ساتھ ایک مرید فرطِ حزن میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا ؎

سروسیمینا بصحرا می روی ۔۔۔ سخت بے مہری کہ بے مامی روی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو ۔۔۔ تو کجا بہر تماشا می روی (۳)

شیخ کے انتقال پر مریدین کی جو حالت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔اس شخص

(۱)ہم سب محتاج ہیں تیری گلی میں آتے ہیں خدا کے لئے اپنے چہرہ مبارک کے جمال سے کچھ تو مل جائے اپنے ہاتھ اور بازو کو ہماری جھولی کی طرف بڑھاؤ تیرے دست و بازو کو شاباش ہے (۲) جلنا اور جلانا ان کا ہی حصہ ہے (۳) میرا محبوب صحرا کی جانب اکیلا ہی جارہا ہے بڑی بے وفائی ہے کہ میرے بغیر جارہا ہے سارے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں آپ کہاں دیدار کرانے جارہے ہیں۔

نے اسی حالت میں یہ اشعار پڑھے تھے۔ دفعۃً حضرت سلطان جی کا ہاتھ کفن میں بلند ہوگیا۔ جیسا کہ وجد کی حالت میں ہوا کرتا ہے۔ لوگوں نے اس مرید کو روکا کہ اشعار پڑھنا بند کرو۔ نہ معلوم کیا سے کیا ہوجائے گا۔ پھر کچھ دیر کے بعد ہاتھ کفن میں سیدھا ہوگیا۔ یہ تو موت سے پہلے اور موت کے بعد متصل کی حالت تھی اور برزخ کی حالت کے بارے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو ربِ تو کیست گویم آں کس کہ ربود ایں دل دیوانہ(۱)

ان حضرات کو پھر غم کیوں ہو اور بعض تفاسیر پر موت کے قریب کی حالت خود نص میں مذکور ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ M نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ N ؕ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ O﴾(۲) کہ فرشتے ان کو بشارتیں سناتے ہیں اور مطمئن و بے فکر کردیتے ہیں۔ اس کے بعد قیامت ہے سو ان کے حق میں وہ بھی فکر کی چیز نہیں۔ چنانچہ منصوص ہے: ﴿لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ﴾(۳) حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے اسی معنی میں ایک شعر سنا ہے۔ فرماتے تھے ؎

عاشقاں را باقیامت روزِ محشر کار نیست
عاشقاں را جز تماشائے جمالِ یار نیست(۴)

---

(۱) قبر میں جب منکر نکیر آکر سوال کریں گے کہ تیرا رب کون ہے میں کہہ دوں گا وہ ہے جو میرے اس دیوانے دل میں بسا ہوا ہے (۲) ''جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔ ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمہارا اس میں جس چیز کو جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اس میں جو مانگو گے موجود ہے'' سورۂ حم السجدۃ: ۳۰ تا ۳۲ (۳) ''ان کو بڑی گھبراہٹ غم میں نہ ڈالے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے'' سورۂ انبیاء (۴) عاشقوں کو محشر کے دن بھی بھلا قیامت سے کیا کام ان کو تو جمال یار ہی مطلوب و مقصود ہے اور وہ محشر کو بھی جمال ہی کے طالب ہونگے۔

اب بتلایئے! جس کے نزدیک روزِ محشر جلوۂ دیدارِ محبوب کا دن ہو اُس کو قیامت سے کیا پریشانی ہوگی؟ کچھ بھی نہیں۔

پل صراط پر اہل اللہ کا حال

مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے کہ اہل اللہ جب جہنم کے اوپر سے پار ہوکر جنت میں پہنچ جائیں گے تو باہم کہیں گے کہ ہم نے سنا تھا کہ پل صراط جہنم کے اوپر ہے مگر ہم کو تو راستہ میں جہنم نظر نہیں پڑی۔ تو فرشتے کہیں گے کہ تم نے راستہ میں ایک باغ دیکھا تھا؟ کہیں گے ہاں، باغ تو دیکھا تھا۔ فرشتے کہیں گے کہ وہی جہنم تھی۔ تمہارے اعمال کی برکت سے وہ باغ کی صورت میں تم کو نظر آیا۔ تو ان کے لئے تو جہنم بھی آتشِ خلیل کی طرح گلزار ہوجائیگی۔ پھر اُن سے زیادہ راحت میں کون ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمان پل صراط پر سے گزریں گے تو جہنم مومن سے کہے گی:

جزیا مومن فان نورك اطفاء ناری

اے مسلمان! جلدی سے آگے بڑھ جا۔ تیرے نور نے تو میری آگ ہی کو بجھادیا۔ اس کی تفسیر میں بعض نے فرمایا ہے کہ جیسے مومن جہنم سے پناہ مانگتا ہے ایسے ہی جہنم بھی مومن سے پناہ مانگتا ہے۔ تو جس سے جہنم بھی پناہ مانگے جو رأس الغموم ہے(۱) اس کی خوشی کی کیا حد ہوگی۔ اور واقعی جہنم کو مومن سے پناہ مانگنی چاہیئے کیونکہ مومن اور جہنم میں کوئی مناسبت نہیں اور جہاں مناسبت نہ ہو وہاں تو طرفین سے اعراض ہی ہوگا(۲)۔ اس مضمون کو ایک شاعر نے دوسرے رنگ سے بیان کیا ہے ؎

(۱) جو تمام غموں کی اصل ہے (۲) ہر ایک دوسرے سے دور ہی رہنا چاہے گا۔

میں جو ہوں قابلِ دوزخ تو گناہوں کے سبب
لیک دوزخ نے کیا کیا جو میرے قابلِ ہے(۱)

یعنی جہنم نے کیا قصور کیا جو مجھے اس کے اندر بھیجا گیا۔ واقعی مسلمان بھی عجیب چیز ہے کہ دوزخ سے وہ بُعد چاہتا ہے اور دوزخ اس سے بُعد چاہتی ہے۔

دولتِ ایمان قابلِ قدر ہے

صاحبو! اس دولتِ ایمان کی قدر کرو۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ اہل اللہ سے بڑھ کر راحتِ قلب کسی کو حاصل نہیں اور یہی روح ہے دنیا کی۔ تو معلوم ہوا کہ طالبانِ دنیا کو دنیا سے کچھ بھی حصہ نہیں ملا۔ وہ تو محض ظاہری اسباب کو لئے بیٹھے ہیں اور روحِ دُنیا اُن ہی لوگوں کو حاصل ہے جن کو تم تارکِ دنیا کہتے ہو۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روحِ دُنیا طلبِ دنیا سے نہیں ملتی بلکہ ترکِ دنیا سے ملتی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ ایسی چیز کے عاشق ہیں جس کے ملنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس سے نفرت کی جائے، محبت نہ کی جائے۔

اہل اللہ کے راحت میں ہونے کا راز

یہ تو اس کا اثبات تھا کہ دنیا کی راحت اہل اللہ ہی کو میسر ہے۔ باقی رہا یہ کہ کیا ہے راز ان کی اس راحت کا؟ سو وہ یہ ہے کہ اہل اللہ اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہیں کرتے کیونکہ تجویز کرنا دعوی ہے ہستی کا کہ ہم بھی کچھ ہیں اور ہماری تجویز بھی کوئی چیز ہے اور ان کا مذاق فناءِ محض ہے۔ وہ اپنے کو مٹا چکے یعنی اپنے ارادہ اور تجویز کو فنا کر چکے ہیں جیسا فرماتے ہیں ؎

خودثنا کردن زمن ترک ثناست ایں دلیلِ ہستی وہستی خطاست(۲)

(۱) وہ دوزخ سے دوری چاہتا ہے اور دوزخ اس سے دوری چاہتی ہے (۲) تعریف کرنے میں بھی اپنی ہستی اور وجود کا اظہار ہے میں نے چونکہ اپنے وجود کو فنا کر دیا اس لئے تعریف کرنے کو بھی ترک کر دیا کہ اس میں اپنے وجود کا احساس تو ہے۔

وہ تو اپنی طرف سے ثنا بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی ہستی کی دلیل ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی ثنا کریں ہم ہیں کیا چیز جو اُن کی ثنا کرسکیں۔

شبہ کا جواب

رہا یہ شبہ کہ پھر اہل اللہ کے کلام میں حق تعالیٰ کی ثنا کیوں ہے اور حضور ﷺ نے کیوں ثنا کی ہے۔

اس کا جواب اہل اللہ نہیں دے سکتے۔ صوفیاء نے اس کا جواب حدیث سے دیا ہے کہ عارف ''بی یسمع وبی ینطق وبی یبصر''(۱) کے درجہ میں ہوتا ہے اسی لئے وہ ثنا اس کی طرف منسوب نہیں ہوتی بلکہ حق تعالیٰ ہی ثنا کرتے ہیں جیسے شجرۂ طور سے آواز آئی'' کیا شجرہ اپنے آپ کو رب العٰلمین کہہ رہا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ کوئی اس سے کہلوا رہا تھا اور کہنے والا دوسرا تھا۔

کاش! اگر اہلِ افتاءِ منصور کے انا الحق کو بھی شجرۂ طور کے انا اللہ پر قیاس کرتے تو وہ بے چارے دار نہ کھینچتے(۲)۔ مگر علماء یہ سمجھے کہ شجرۂ طور غیر عاقل تھا اور منصور عاقل ہیں حالانکہ وہ محض ناقل تھے۔ جیسے عدالت کا اردلی مقدمہ والوں کے پکارنے میں محض ناقل ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے رئیس کا نام لے کر پکارتا ہے کہ فلاں ولد فلاں حاضر ہے۔ اس وقت کوئی اس کی بات سے ناراض نہیں ہوتا کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ خود نہیں کہہ رہا بلکہ نقل کر رہا ہے اور دوسرے وقت میں اس کو کیا مجال ہے جو رئیس کے سامنے آ بھی سکے اور بول بھی سکے اور نام لینا تو درکنار اور نام لے کر پکارنا تو بڑی بات ہے۔

ایسے ہی اہل اللہ ثنائے الٰہی کے وقت ناقل ہوتے ہیں خود ثنا نہیں کرتے نہ اپنے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فانی محض ہوتے ہیں۔ جب فانی ہیں تو پھر یہ

(۱) میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے (۲) پھانسی نہ دئے جاتے۔

حضرات تجویز کہاں کر سکتے ہیں اگر ان کا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے تو وہ دوا اور دعا سب کچھ کرتے ہیں مگر دل سے ہر پہلو پر راضی ہوتے ہیں۔ اگر مر گیا تو وہ اول ہی سے اس پر راضی تھے۔ گو طبعی رنج ہو اس کا مضائقہ نہیں مگر دل سے وہ اس پر راضی ہوتے ہیں اور تمام کلفتوں کی جڑ یہی تجویز اور توقع ہے۔ اور جو شخص تجویز اور توقع کو فنا کر دے گا وہ ہر حال میں راحت ہی سے رہے گا بلکہ اگر کوئی دنیا دار شخص اہل اللہ سے ناتمام تشبہ بھی حاصل کر لے وہ بھی دوسروں سے راحت میں رہے گا۔

حکایت

چنانچہ ایک جنٹلمین تھے وہ ملاّ نے جنٹلمین تھے یعنی آزاد دنیادار۔ ان کی حالت یہ تھی کہ ہیٹ بھی لگائے ہوئے ہیں اور لُنگی بھی پہنے ہوئے ہیں۔ لوگ بہت ہنستے کہ ہیٹ اور لنگی کا کیا جوڑ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ لباس راحت کے لئے پہنا جاتا ہے اور پتلون میں راحت نہیں ہے بلکہ آدمی اس میں جکڑ بند ہو جاتا ہے اس لئے لنگی باندھ لی۔ اور ہیٹ میں راحت ہے کہ اس سے دھوپ وغیرہ سے نگاہ کی حفاظت ہے اس لئے میں راحت کی چیز اختیار کرتا ہوں خواہ جوڑ ہو یا نہ ہو۔ جب ان کے والد صاحب کے انتقال کا تار آیا تو باورچی نے کھانا نہیں پکایا کہ آج کیا کھائیں گے، وقت پر کھانا مانگا، اُس نے کہا، میں نے تو آج اس خیال سے کہ والد صاحب کا صدمہ ہوگا کھانا نہیں پکایا۔ تو اس پر پانچ روپیہ جرمانہ کیا(یہ تو واہیات حرکت تھی، اور کہا، سبحان اللہ! وہ تو اپنی موت سے مرے اور تم ہم کو زندگی میں بھوکا مارنا چاہتے ہو۔ یہ بات عقل کی تھی اور حقیقی آزادی کی جس میں سرتا سر راحت ہے۔

تو حضرت اصل دنیادار تو اہلِ دین ہی ہیں کہ دنیا کی روح یعنی راحتِ

قلب تو ان ہی کے پاس ہے اور دنیاداروں کے پاس بجز ٹیپ ٹاپ کے راحت خاک بھی نہیں اور اگر کسی کو کچھ راحت ہے بھی تو وہ بھی اہل اللہ کے تشبہ کی برکت ہے۔ یہ تو طریقہ تھا دنیا سے بے توجہی کا کہ دنیا کی حقیقت میں غور کیا جائے۔

توجہ آخرت کا طریقہ

اب آخرت کی طرف توجہ کا طریقہ سنیئے۔ وہ بھی یہی ہے کہ آخرت کی حالت میں غور کرو کہ اس کی ایک حالت تو یہ ہے کہ وہاں رنج وغم کا نام نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طلبِ آخرت کا دنیا میں یہ نتیجہ ہے کہ طالبِ آخرت کو یہاں بھی راحتِ قلب حاصل ہوجاتی ہے تو خود آخرت میں پہنچ کر کیا حال ہوگا۔

دوسری حالت یہ ہے کہ آخرت پائیدار ہے اس کی نعمتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔ تیسری حالت آخرت کی یہ ہے کہ جتنی اس کی طلب کی جائے اس سے زیادہ ملتی ہے بلکہ جتنی تم چاہ بھی نہیں سکتے اتنی ملتی ہے۔

طلب دنیا کی حقیقت

اور دنیا کی یہ حالت ہے کہ جتنی مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں اتنی بھی نہیں ملتی ؎

وما قضٰی احد منها لبانته لا ینتهی ادب الی ادب

مشاہدہ ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ جتنی دنیا چاہتا ہے اتنی نہیں ملتی اور آخرت کی یہ حالت ہے کہ اس کے طالب کے سب مطلوبات اس کو ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ راحت کا طالب ہے، جنت کا طالب ہے، رضائے حق کا طالب ہے، دوستوں کی ملاقات کا طالب ہے۔ یہ سب باتیں مع شے زائد اس کو ملیں گی اور بہت سی چیزیں تو اس کو دنیا ہی میں مل جاتی ہیں مثلاً راحتِ قلب و رضائے حق۔ البتہ یہاں تغیر کا کھٹکا لگا رہتا ہے وہاں اس سے بھی اطمینان ہے اسی کو حق تعالیٰ

فرماتے ہیں: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا A ﴾(۱) کہ جو شخص حیاتِ عاجلہ یعنی دنیا کا طالب ہے اس کو ہم جتنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں یہاں ہی دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں ذلت ورسوائی کے ساتھ داخل ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جو پکا دنیا دار ہے جو محض دنیا ہی کا طالب ہے یعنی کافر۔ جو آخرت کو جانتا ہی نہیں دنیا ہی میں منہمک ہے تو اس کو بھی جتنی وہ چاہتا ہے اتنی نہیں ملتی اور نہ ہر ایک کو ملتی ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

تفسیر آیت کے ذیل میں طلب آخرت کی حقیقت

﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا B ﴾(۲) اور جو آخرت کو طلب کرے اور اس کے لئے کما ینبغی کوشش کرے۔ یہاں ﴿وسعی لها سعیه﴾ کو جو بڑھایا گیا ہے یہ ﴿اراد الاخرة﴾ کی تفسیر ہے اور یہ اس واسطے بڑھایا گیا تاکہ ہوسناکوں کی ہوس کو قطع کر دیا جائے کیونکہ بہت لوگ ارادۂ آخرت کے بارے میں اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ زبان سے یوں کہہ لیا جائے کہ نیت کرتا ہوں میں طلبِ آخرت کی۔ اللہ اکبر! یعنی بہت لوگ محض تمنائے آخرت کو طلبِ آخرت سمجھتے ہیں اور اس کے اسباب کو اختیار نہیں کرتے (اور یہ حالت آخرت ہی کے ساتھ ہے دنیا کے ساتھ کسی کا یہ برتاؤ نہیں کہ محض تمنا کو کافی سمجھ لے۔ اسی واسطے ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ ﴾ کے بعد ﴿وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا﴾

(۱) ''جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کر دیں گے وہ اس میں بدحال راندہ ہو کر داخل ہوگا'' سورۂ بنی اسرائیل: ۱۸ (۲) ''اور جو شخص آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہیئے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مؤمن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی سعی مقبول ہوگی'' سورۂ بنی اسرائیل: ۱۹

نہیں بڑھایا گیا کیونکہ وہاں تو ارادہ کے معنی بھی عام طور پر یہ ہیں کہ خوب سعی کی جاوے۔ پس یہ شبہ نہ رہا کہ ارادۂ عاجلہ میں تو سعی کی قید نہیں اور یہاں سعی کی قید ہے۔ تو آخرت کی فضیلت دنیا پر پوری طرح واضح نہ ہوئی۔ اگر یہاں بھی محض ارادہ سے بحث ہوتی تو مقابلہ کامل ہوتا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ ﴿وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا﴾ دونوں جگہ مراد ہے مگر وہاں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں ارادہ کے معنی میں لوگوں نے غلطی نہیں کی اور یہاں بیان کی ضرورت تھی کیونکہ یہاں معنی ارادہ میں غلطی کا وقوع ہو رہا ہے ۱۲ اظ) اور ﴿وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا﴾ فرمایا سعی لها سعیه نہیں فرمایا کہ آخرت کے لئے اپنی سی کوشش کرے کیونکہ اس میں کم ہمتوں کو موقع مل جاتا کہ ہر شخص ذرا سا کام کر کے کہہ دیتا کہ بس میری ہمت تو اتنی ہی ہے۔ تو ان کم ہمتوں کے بہانے قطع کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ آخرت کے لئے آخرت کے مناسب کوشش کرے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کرے جیسا کہ ظاہر میں شانِ آخرت کی عظمت سے مفہوم ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب وہی ہے کہ اپنی سی کوشش کرے اور اپنی ہمت کے موافق سعی کرے۔

چنانچہ دوسری جگہ اس کی تفسیر ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۱) سے کی گئی ہے۔ پس حاصل ﴿وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا﴾۔ وسعی لها سعیه کا ایک ہی ہے لیکن ﴿سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا﴾ کے بعد سعی لها سعیه کا مفہوم جو ذہن میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ اپنی سی کوشش ختم کر دے اور اس کے بغیر کم ہمتوں کو بہانہ کا موقع مل جاتا خوب سمجھ لو۔ چنانچہ اس حکمت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کو اول نازل نہیں فرمایا بلکہ اول ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ (۲) کا نزول ہوا جس سے صحابہ گھبرا گئے کہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب تقویٰ کس سے ہوسکتا ہے، تب تسلی کے لئے

(۱) اللہ سے اپنی طاقت کے بقدر ڈرو (۲) اللہ سے اتنا ڈرو جتنا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ نازل ہوا اور یہ اس کے لئے ناسخ نہیں بلکہ مفسر ہے۔ ﴿فَاتَّقُو اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو۔ اور سلف کے کلام میں اگر اس کو کہیں ناسخ کہا گیا ہے تو اس سے بھی مراد تفسیر ہی ہے۔ لیکن سلف کے کلام میں بیان تبدیل و بیان تفسیر سب کو نسخ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال مقصود تو تقویٰ بقدرِ استطاعت ہے لیکن اس کو ﴿فَاتَّقُو اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ کے بعد اس کی تفسیر میں بیان فرمانے سے کم ہمتوں کے بہانے قطع ہو گئے۔ اور اول ہی اس کا نزول ہو جاتا تو کم ہمتوں کو بہانہ ڈھونڈھنے کا موقع مل جاتا۔ ایسا یہاں سمجھو کہ ﴿وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا﴾ ﴿فَاتَّقُو اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا حاصل سعی لھا سعیہ کی طرف لوٹتا ہے مگر سعی لھا سعیہ نہ فرمانے میں وہ حکمت ہے جو ابھی بیان ہوئی۔ واللہ اعلم باسرار کلامہ(۱)۔

بہرحال ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آخرت کا طالب ہو تو اس کی جزا یہ ہے کہ ﴿اُولٰئِکَ کَانَ سَعْیُکُمْ مَشْکُوْرًا﴾ ان کی سعی کی قدر کی جائیگی۔ بظاہر یہاں کچھ انعام کا ذکر نہیں۔ مگر قرآن شاہی کلام ہے اس میں شاہانہ محاورات کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے اور شاہی محاورہ میں یہ لفظ بہت بڑا ہے۔ یہ ہزاروں تفاصیل سے بڑھا ہوا ہے۔ جب بادشاہ کسی سے کہہ دے کہ ہم نے تمہاری خدمت کی قدر کی ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ بہت کچھ ملے گا اور امید سے زائد ملے گا۔ اب سمجھ لو کہ جس کی سعی کی احکم الحاکمین قدردانی فرمائیں اس کو تو کیا کچھ ملے گا۔

ایسے ہی قرآن میں جو بعض جگہ ﴿لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ وغیرہ آیا ہے یہ بھی شاہانہ محاورہ ہے۔ بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ انہی لفظوں کے ساتھ وعدہ کیا کرتے ہیں کہ امیدوار باشید(۲)۔ اور یہ لفظ اُن کے کلام میں دوسروں کی قسموں سے زیادہ مؤکد ہے۔ پس ایک بات تو آخرت کی یہ قابل رغبت ہے کہ اس کی طلب بیکار نہیں جاتی بلکہ ثمرہ ضرور مرتب ہوتا ہے بخلاف دنیا کے کہ وہاں اس کا وعدہ نہیں۔

(۱) اللہ ہی اپنے کلام کے اسرار و رموز کو زیادہ جانتا ہے (۲) امید رکھنی چاہیئے۔

آخرت کی کثیر جزائیں

پھر یہ کہ طالبِ آخرت کو طلب سے زیادہ ملتا ہے چنانچہ ایک عمل کا دس گنا ثواب تو ہر شخص کے لئے مقرر ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾(۱) اور بعضوں کو سات سو گنا بھی ملے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾(۲) پھر اسی پر بس نہ رہی بلکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾(۳) اب تو کچھ حد ہی نہ رہی کیونکہ دوسری آیت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب پہلی آیت کے نزول پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی: اللھم زدنی (وکذا ذکر فی التفسیر المظھری من عدۃ کتب الحدیث)(۴) تو یقیناً اس میں پہلی آیت سے زیادہ ہی تضاعف ہے۔

اور مفسرین نے اس کے ہر ضعف کو سات سو کہا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کثرت کثیرہ میں تو شبہ ہی نہیں وہ تو منصوص ہے۔

اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کے راستہ میں ایک چھوارہ کوئی دے تو حق تعالیٰ اس کو یہاں تک بڑھاتے ہیں کہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔ اس سے اور بھی حد بڑھ جاتی ہے کیونکہ چھوارہ کے برابر احد پہاڑ کے اجزا کرنے بیٹھو تو اجزا کرنے ہی میں سو دو سو برس لگ جائیں گے گویا اتنا بے حساب ملے گا بعض جاہل لوگ تو اتنی جزا کو سن کر ہی گھبرا گئے۔

جاہلانہ اعتراض کا جواب

چنانچہ ایک جاہل آریہ نے لکھا ہے کہ جزا کا جو قاعدہ مسلمانوں میں ہے

(۱) ''جو ایک نیکی لائے گا اس کو دس گنا دیا جائے گا'' (۲) ''اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی مثال اس دانے کی سی ہے جس میں سے سات بالیں نکلیں ہر بال میں سو دانے ہوں تو سات سو گنا ہو گیا'' (۳) ''پھر ان کے لئے اس کو اس سے بھی زیادہ بڑھا دیا جائے گا'' (۴) ''جیسا کہ تفسیر مظہری میں حدیث کی متعدد کتابوں سے نقل کیا گیا''۔

وہ ٹھیک نہیں کیونکہ ہمارے اعمال تو محدود ہیں اُن پر جزائے غیر محدود کا مرتب ہونا ایسا ہے جیسا کہ پاؤ بھر کی غذا والے کو پچاس من کھلا دیا جائے۔ وہ تو مرجائیگا پس محدود کو جزائے غیر محدود کی طاقت کہاں!

اس جہالت کی بات کا جواب ظاہر ہے کہ پاؤ بھر کی غذا والا پچاس من کھلانے سے اس وقت مرے گا جب کہ اس کو ایک وقت میں ایک دم سے کھلا دیا جائے۔ اور اگر جزائے غیر محدود کے ساتھ عمر بھی غیر محدود ہو اور عمر غیر محدود میں غیر محدود غذا کھلائی جائے تو بتلایئے اس میں کیا اشکال ہے۔ اس جاہل نے جزا کو تو غیر محدود رکھا اور عمر کو محدود لے لیا اور خواہ مخواہ اعتراض کردیا۔ یہ نہ دیکھا کہ مسلمان عمر دارالجزاء کو بھی غیر محدود کہتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ آریہ خود نجاتِ ابدیہ کے بھی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک جو آدمی نیک ہوتا ہے وہ عالمِ ارواح میں ایک محدود مدت تک رہ کر تناسخ کے طور پر عالمِ اجسام میں آجائیگا۔ اس لئے اس نے مدتِ جزا کو حاصل کرلیا اور اشکال کردیا۔ مگر حقیقت میں تو یہ اشکال اس کے مذہب پر ہے اسلام کی تعلیم پر کوئی اشکال نہیں مگر تعصب سے عقل مسخ ہوجاتی ہے اس لئے جو جی میں آیا ہانک دیا۔ تو آخرت میں جزا اتنی ملے گی جس کو سن سن کر ایسے جاہل تو گھبرا ہی گئے۔

غرض وہاں یہ حال ہے ؎

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　آنچہ درد ہمت نیاید آں دہد
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　کہ بیک گل می خری گلزار را (۱)

اور جب ان کی طرف سے ایسی جاں بخشی کا برتاؤ ہے تو ہم کو بھی حق تعالیٰ کے ساتھ جان دادن کا یہ برتاؤ کرنا چاہیئے ؎

(۱) آپ ایک جان لیتے ہیں تو سو جانیں دیتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا وہ نعمتیں دیتے ہیں اس بازار کا کیا حال ہوگا کہ جہاں صرف ایک پھول کے عوض پورا باغ ہی دیدیا جاتا ہے۔

ہمچو اسماعیل پیشیش سربنہ شادو خنداں پیشِ تیغش جاں بدہ (۱)

جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والے کا حال

حدیث میں ہے کہ جنت میں سب سے اخیر میں جو شخص داخل ہوگا، حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جا جنت میں جا۔ وہ جائے گا تو وہاں ہجوم اور مجمع دیکھے گا۔ حق تعالیٰ سے عرض کرے گا کہ یہاں تو جگہ بھی نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تجھ کو دنیا سے دس گنا زیادہ رقبہ جنت میں دیا۔ وہ کہے گا ((اتستھزی بی وانت رب العٰلمین)) کیا آپ رب العٰلمین ہوکر مجھ سے ہنسی کرتے ہیں۔ یہاں تو ذرا سی بھی جگہ نہیں اور آپ دنیا سے دس گنا بتلاتے ہیں۔ یہ شخص جاہل جنتی ہوگا گنوار اسی واسطے ایسی بے باکانہ گفتگو کرے گا کیونکہ جنت میں جاہل بھی ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک نے نماز کے بعد بہت لوگوں کو مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا خوش ہوئے اور فرمایا نعم حشو الجنة هم کہ الحمدللہ! یہ سب جنت کی بھرتی ہیں مگر کام کے آدمی ان میں دو تین ہی ہوں گے۔

جنت اور دوزخ کی وُسعت

صاحبو! تم جنت کے طالب ہو تو جنت تو ان شاء اللہ تم کو ملے ہی گی۔ جنت تمہارے ہی واسطے ہے کفار کے واسطے تھوڑا ہی ہے اس سے تو بے فکر رہو بس ذرا بُرے بُرے کام چھوڑ دو۔ مگر جی یوں چاہتا ہے کہ جنت کی بھرتی نہ بنو بلکہ کام کے آدمی بنو۔ تو جنت میں اتنی وسعت ہے کہ سب سے ادنیٰ مسلمان کو بھی دنیا

(۱) جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ہنسی خوشی اپنی جان پیش کی تھی تم بھی اسی طرح اپنی جان دیدو۔

سے دس گنا رقبہ جنت میں ملے گا۔

اس پر بعض نیچریوں نے اعتراض کے طور پر کہا ہے کہ ہم نے تو سارا جغرافیہ پڑھا ہے ہم کو تو جنت کا کہیں پتہ نہیں لگا۔

اس کا جواب میں نے یہ دیا ہے کہ تم نے جغرافیہ ارضی پڑھا ہے جغرافیہ عالم نہیں پڑھا ہے۔ وہ ہمارے پاس ہے۔ اگر تم جغرافیہ عالم پڑھتے یعنی قرآن تو تم کو جنت کا پتہ چل جاتا۔ اور جن لوگون نے یہ جغرافیۂ عالم پڑھا ہے ان کو جنت کا بھی علم ہے اور دوزخ کا بھی اور پل صراط کا بھی اور عرش و میزان کا بھی اور بعض کو تو ان میں دنیا ہی کے اندر سب کا انکشاف ہوگیا ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ بڑے صاحبِ کشف ہیں۔ انہوں نے تو جنت اور دوزخ کی پیائش تک کرلی ہے کیونکہ دونوں باوجود وسعت کے ہیں تو محدود ہی اور محدود کی پیائش ممکن ہے لیکن اگر حواسِ جسم سے پیائش کی جاتی تو پھر بھی عرصہ دراز لگتا۔ جب قوی روحانیہ سے پیائش کی گئی تو عرصہ دراز کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کیونکہ روح کی قوت بہت زیادہ ہے۔ نیز شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دریا بھی منکشف ہوا ہے جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ اس کی ایک ایک لہر آسمان و زمین سے دس گنا زیادہ ہے مگر فرشتے اس کی لہروں کو روکے ہوئے ہیں ورنہ آسمان و زمین سب غرق ہوجاتے۔

جنت کی وسعت پر شبہ کا جواب

پھر بعض جاہلوں نے یہ شبہ کیا ہے کہ جنت جب اتنی بڑی ہے کہ عرضہا السمٰوٰت والارض (۱) تو وہ سماتی کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو اس شبہ کا حق نہیں کیونکہ تمہارے مقتدر اہلِ

(۱) اس کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے۔

سائنس اس بات کے خود قائل ہیں کہ فضاء الجو(۱) غیر متناہی ہے پھر اس غیر متناہی میں اگر جنت بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ممکن ہے کہ جس طرح مریخ میں تم آبادی کے قائل ہو اسی طرح کوئی کرۂ جنت بھی ہو اور وہاں بھی آبادی ہو مگر بوجہ بُعد کے وہ کرہ تم کو نظر نہ آتا ہو کیونکہ مریخ کی آبادی کا علم تم کو اس لئے ہوا ہے کہ تم اس کو زمین سے قریب مانتے ہیں اور یہ جواب بطورِ الزام کے ہے ورنہ جنت کو ہم اس فضاء الجو سے باہر ساتوں آسمانوں سے اوپر مانتے ہیں چنانچہ قرآن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جنت آسمانوں سے آگے ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ﴾(۲)

اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سمٰوٰت سبعہ سے اوپر اور عرش سے نیچے ہے اور عرش ان سب سے بڑا ہے۔ اس سے بڑی کوئی مخلوق نہیں۔ شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ کو جو دریا منکشف ہوا ہے جس کی ایک لہر آسمان وزمین سے دس گنی ہے عرش سے وہ بھی اس کو نیچے لکھتے ہیں اور عرش گو سب سے بڑا ہے مگر وہ بھی محدود ہے اور حق تعالیٰ کی ذات حد سے منزہ ہے۔ وہ غیر محدود ہے۔

استویٰ علی العرش کے معنی

تو یہاں سے ان لوگوں کو غلطی واضح ہوگئی جو عرش کو حق تعالیٰ کا مکان سمجھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ عرش پر ایسے مستقر ہیں جیسے ہم اپنے مکان میں ہیں۔ بھلا غیر کو محدود کیونکر محیط ہوسکتا ہے اور مکان کے لئے مکین پر محیط ہونا لازم ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر استویٰ علی العرش کے کیا معنی ہیں؟۔

اس کے جواب میں سہل طریق تو سلف کا ہے کہ اس میں سکوت کیا جائے

(۱) خلاء کو غیر متناہی مانتے ہیں (۲) ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائینگے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جائے۔

اور کہہ دیا جائے کہ اس کے معنی ہم کو معلوم نہیں۔ جو بھی مراد ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اگر تاویل کی ٹھہرے تو وہ تاویل سہل ہے جو میں نے بارہا بیان کی ہے کہ استوی علی العرش شاہی محاورہ ہے جیسا کہ فارسی میں تخت نشینی ہے اور تخت نشینی کنایہ ہے تصرف و تدبیر مملک اور تنفیذ امر ونواہی سے (۱) ورنہ حقیقت معنی تو بعض جگہ مفقود ہوتی ہے (۲) کہ بادشاہ فرش پر بیٹھ کر احکام جاری کرتا ہے اور آج کل تو کرسیوں کی نشست کی رسم عام ہونے سے معدوم ہی ہے مگر یہ محاورہ اب بھی موجود ہے۔ تو جو معنی تخت نشینی کے آج کل ہیں یعنی متصرف فی الامور ہونا (۳) وہی استوی علی العرش کا مفہوم ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ بعض آیات میں استوی علی العرش کے ساتھ یدبر الامر بھی وارد ہے۔

اور اگر کوئی وسعتِ جنت پر یہ شبہ کرے کہ اتنی بڑی جنت میں کیونکر رہیں گے۔ جی نہ گھبرائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں خدّام اور اسبابِ تنعم بھی بہت سے ملیں گے جن سے تمام مکان پُر ہوگا جن سے جی لگ جائے گا۔

بہرحال جنت کے ان حالات کو سوچو۔ اس سے طلبِ آخرت وتوجہ الی الآخرت پیدا ہوگی کہ حق تعالیٰ ہماری ذراسی طلب پر اتنی بڑی جنت دیں گے اور طلبِ دنیا پر کچھ بھی وعدہ نہیں۔

طالب علمانہ شبہ کا جواب

شاید یہاں کسی طالب علم کو شبہ ہو کہ ایک آیت میں تو طلبِ دنیا پر بھی ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا

(۱) تخت نشین ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے احکام چل رہے ہیں اور اس کے حکم سے ہر کام ہوتا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تخت پر بیٹھا ہے (۲) حقیقی معنی یعنی تخت پر بیٹھنا تو بعض جگہ پائے ہی نہیں جاتے (۳) احکام میں تصرف کرنا۔

نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ (۱) اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں وعدہ ہے تو منھا کے ساتھ ہے جس میں مِنْ تبعیضیہ ہے تو کل کا وعدہ کہاں ہوا جزءِ قلیل کا وعدہ ہوا۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ایک آیت میں آخرت کے متعلق بھی منھا آیا ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾ (۲)

جواب یہ ہے کہ وہاں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ من ابتدائیہ ہے تبعیضیہ نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث سمجھنے کے لئے نحو صرف کی بھی ضرورت ہے۔

آج کل ہر جاہل مجتہد ہے

مگر آج کل بہت سے لوگ بدون صرف ونحو کے قرآن وحدیث کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نئے مجتہدین تو بہت جلدی حدیث کا ترجمہ پڑھنے لگتے ہیں بس دوچار رسالے اردو کے پڑھے اور مشکوۃ بخاری کا ترجمہ شروع کردیا اور لگے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کرنے۔

ایک جاہل کہتا تھا کہ حدیث میں تو آیا ہے کھداجٌ کھداجٌ اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ''سورۂ فاتحہ پڑھنا پھرج (فرض) نہیں'' واقعی یہ بھی عجیب زمانہ ہے جس میں ہر جاہل بھی مجتہد ہے۔ مگر تعجب نہیں آج کل مسلمان تو مسلمان انگریز بھی اسلام میں اجتہاد کرنے لگے ہیں۔ ایک انگریز رام پور میں مسلمانوں کے ایک مجمع میں کہہ رہا تھا کہ کُران (قرآن) سے ثابت ہے کہ طاعون لگتا (لگتا) ہے کُران (قرآن) میں ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے نہ جاؤ۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ اس نے اپنی طرف سے لگالیا کہ جانے کی ممانعت کا سبب یہی ہے کہ طاعون لگتا ہے۔ اس لئے منع فرمایا کہ یہاں کا طاعون وہاں نہ پہنچ جائے۔ پس دعویٰ ثابت

(۱) ''جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا دیدیں گے (۲) جو شخص اپنے عمل سے دنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا میں کچھ حصہ دیدیتے ہیں اور جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے تو اس کو آخرت کا ثواب ملتا ہے اور ہم عنقریب شکرگذاروں کو بدلہ دیں گے۔

ہوگیا۔ تو یہ انگریز بھی اسلام میں مجتہد ہونے کا مدّعی تھا جبھی تو اپنی طرف سے ایک مقدمہ لگالیا۔

اور اس سے بڑھ کر یہ بھی ہندو بھی دینِ اسلام میں مجتہد ہونے لگے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ایک ہندو کی نسبت اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ وہ قید خانہ میں قرآن کا مطالعہ کررہا ہے اور مسلمانوں کے لئے قرآن سے راہِ عمل تجویز کرے گا۔ پھر اُس نے قید خانہ سے نکل کر یہ فتوی بھی دیا کہ ہم کو قرآن میں گائے ذبح کرنے کا حکم نہیں ملا اس لئے مسلمان اس طریقہ کو چھوڑ دیں۔ تو اگر ایک جاہل مسلمان آج کل مجتہد ہوجائے تو کیا تعجب ہے مگر ان جہالتوں سے اسلام کو ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد(۱)
چراغے را کہ ایزد بر فرو زد ہرآں کس تف زند ریشش لب بسوزد(۲)

اگر یہ دین انسانوں کے اختیار میں ہوتا تو آج تک کبھی کا مٹ چکا ہوتا جبکہ ایسے ایسے جاہل اور کافر تک مجتہد بننے کے مدعی ہیں مگر اس کو تو خدا نے اپنے قبضہ میں رکھا ہے اور خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾(۳)

اور اسی واسطے مسلمان تبلیغ اسلام کی طرف سے بے فکر ہیں کہ بس اللہ میاں نے اس کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ اس لئے یہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔ مگر اتنی بے فکری تو اچھی نہیں اس سے دین کا تو نقصان نہیں مگر خود ہمارا نقصان ہے کہ ہم خادمانِ دین کی فہرست سے نکل جائیں گے۔ پس نہ اتنی بے فکری چاہیئے اور نہ اتنی فکر کی ضرورت ہے جتنی خیر خواہانِ قوم مثل ڈوم کے گاتے پھریں گے۔

---

(۱) اگر تیز ہوا کے جھکڑ بھی چل جائیں تو مقبول بندوں کے چراغ پھر بھی گل نہیں ہونگے (۲) ایسا چراغ جسے اللہ جلائے اگر کوئی اس کو پھونک مار کر بجھانا چاہے تو اس کے ہونٹ جل جائیں گے (۳) ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

تبلیغ کے آداب

میں نے دیوبند کے مدرسہ میں ایک وعظ کہا تھا جس کا نام ''آداب التبلیغ'' ہے جو گویا علماء کا مصدقہ اور رجسٹری شدہ ہے اس میں مَیں نے تبلیغ کے آداب بیان کیے ہیں اس کا مطالعہ اس باب میں بہت نافع ہوگا۔ اس میں مَیں نے بتلایا ہے کہ تبلیغ کی فکر کا کون سا درجہ مطلوب ہے اور کونسا درجہ غیر مطلوب ہے۔ جس میں ایک مضمون یہ ہے کہ تبلیغ میں ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ یعنی یہ تجویز نہ کرو کہ ہماری سعی سے (۱) شدھی بند ہی ہوجائے یا دس ہزار ہندو مسلمان ہوجائیں کیونکہ اس تجویز وانتظار کا نتیجہ یہ ہے کہ چند دن کے بعد جب اس ثمرہ کے ترتیب میں دیر ہوگی تو ہمت پست ہوجائیگی۔ اس میں راز یہ ہے کہ مبالغہ فی العمل ہمیشہ تقلیلِ عمل کا سبب ہوتا ہے۔

صوفیاء نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں رسول اللہ ﷺ نے تکثیرِ فی العمل سے (۲) منع کیا ہے وہاں حقیقت میں تکثیرِ عمل سے ممانعت نہیں بلکہ تقلیلِ عمل سے (۳) ممانعت ہے کیونکہ اس مبالغہ کا انجام تقلیلِ عمل ہی ہے اور بعض صوفیاء سے جو خود تکثیرِ عمل اور مجاہداتِ کثیرہ منقول ہیں۔ تو اس کا ازالہ ہے کہ ان کے لئے عملِ صالحہ طبیعت ثانیہ اور غذا بن گیا تھا جس کی تکثیر موجب ملال و تقلیل نہ تھی۔

اسی لئے جب کسی زاہد خشک نے ان پر اعتراض کیا کہ اتنا مجاہدہ کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جس سے ﴿لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ﴾ (۴) میں ممانعت ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہر ایک کی ہلاکت جُدا ہے جس کے لئے تکثیرِ عمل موجبِ ہلاکت ہو وہ تکثیرِ عمل ترک کرے اور جس کے لئے تقلیلِ عمل موجبِ ہلاکت ہو وہ تقلیلِ عمل کو ترک کرے اور ہمارے لئے تقلیل موجبِ ہلاکت

(۱) کوشش سے (۲) عمل میں زیادتی (۳) عمل میں کمی (۴) اپنے ہاتوں ہلاکت میں نہ پڑو۔

ہے اس لئے ہم کو تکثیرِ عبادت سے ممانعت نہیں۔

غرض ثمرہ کا انتظار کرنا مضر ہے اس سے عمل میں ہمت چند روز کے بعد شکستہ ہو جاتی ہے(۱)۔ تو ایسی فکر تو مناسب نہیں کہ ہر وقت ایسی فکر ابھی اچھی نہیں جیسی آج کل ہمارے اندر ہے۔ بس یوں کرو کہ اپنی طرف سے تبلیغ کا اہتمام کرو اور ثمرہ کی امید رکھو مگر اس کے انتظار میں نہ رہو بلکہ اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل مذاہبِ اسلام میں ہر شخص اجتہاد کرنے کا دعوی رکھتا ہے اس زمانہ کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ نااہل اپنی حد سے بڑھ کر اہل کی جگہ لینا چاہتے ہیں

ع آدمیاں گم شدند ملکِ خدا خر گرفت (۲)

اور گفتگو اس پر چلی تھی کہ قرآن وحدیث کی فہم کے لئے صرف ونحو وغیرہ کی سخت ضرورت ہے محض ترجمہ کافی نہیں۔ اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ ایک آیت میں قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مِنْ تبعیضیہ ہے اور دوسری جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مِنْ بیانیہ ہے اور یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جس نے صرف ونحو ومعانی کو پڑھا ہو محض ترجمہ سے اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ بہرحال یہ دعویٰ ثابت ہے کہ دنیا تو جتنی چاہتے ہو اتنی بھی نہیں ملتی اور آخرت چاہنے سے زیادہ ملتی ہے۔

طلبِ آخرت

ایک اور آیت قابل تحقیق ہے: ﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی﴾ (۳)

(۱) ہمت ٹوٹ جاتی ہے (۲) حقیقی انسان تو گم ہوگئے اور حکومت گدھوں کے ہاتھ میں آ گئی (۳) کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے ہر تمنا خدا ہی کے اختیاری میں ہے آخرت کی اور دنیا کی۔

یعنی دنیا و آخرت خدا کی مِلک ہیں تمہاری تمنا پر مدار نہیں۔ اس میں سوال یہ ہے کہ جب دونوں خدا کی مِلک ہیں تو یہ تو معلوم نہ ہوا کہ وہ کس کو دینا چاہتے ہیں اور کس کو نہیں۔ سو اس کو دوسری آیات نے حل کر دیا ہے کہ دنیا کو تو وہ نہ سب دینا چاہتے ہیں اور نہ تمنا کے برابر دینا چاہتے ہیں اور آخرت ہر طالبِ آخرت کو جتنا وہ چاہے گا اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ اب بہت ہی بعید از عقل ہے کہ انسان پھر بھی دنیا کا طالب ہو اور آخرت سے غافل ہو۔

طلب کی حقیقت

رہا یہ کہ طلبِ آخرت کی حقیقت کیا ہے، تو اجمالاً اس کو سب جانتے ہیں کہ فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب (۱) کا نام طلب آخرت ہے مگر میں اس وقت ایسی حقیقت بتلانا چاہتا ہوں جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے یعنی اس پر ﴿وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (۲) بطریقِ مفہوم دال ہے کیونکہ یہاں غفلت پر مذمت ہے۔ پس غفلت کی ضد مطلوب ہوگی اور غفلت کی ضد ہے ذکر و فکر جس کا ترجمہ اردو میں دھیان اور دُھن ہے۔ پس طلبِ آخرت کی حقیقت یہ ہوئی کہ آخرت کا دھیان اور دُھن رہے۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ اس میں تو کچھ وظیفے وظائف کی بھی ضرورت نہیں۔ بس اتنی ضرورت ہے کہ دل سے آخرت کی یاد ہو اور اس کی دُھن لگی رہے۔ اگر دھیان اور دُھن لگی رہے گی تو اول تو تم راستہ سے ہٹو گے نہیں اور اگر ہٹو گے بھی تو جلد ہی متنبہ ہو کر راستہ پر لگ جاؤ گے۔

حصولِ آخرت کا طریقہ

اور اس کے حصول کا سہل طریقہ یہ ہے کہ صحبتِ اہل اللہ اختیار کرو۔

(۱) حرام سے بچنے کا نام (۲) وہ آخرت سے بے پرواہیں۔

گاہے گاہے ان سے ملتے رہو۔ ان کے پاس بیٹھو۔ ان سے باتیں سنو۔ ان سے تعلق رکھو اور اگر یہ میسر نہ ہو تو تذکرۂ اولیاء اللہ اس کے قائم مقام ہے۔ اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست صحرائی مے ناب وسفینۂ غزل ست (۱)

سفینۂ غزل سے مراد اہل اللہ کے حالات وملفوظات کی کتابیں ہیں۔ اگر شیخ کامل میسر ہو تب تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر یہ میسر نہ ہو تو غیر کامل کی صحبت ومخالطت ومجالست (۲) ہی ترک کردو یا کم کردو کیونکہ غیر کامل کی صحبت سخت مضر ہے۔ اگر اس کے پاس بیٹھ کر محرمات کی گفتگو نہ بھی ہوئی (۳) تو مباحات ہی میں زیادت ہوگی اور مباحات میں حد سے زیادت مضر ہے۔ حدیث میں ہے۔

((ایاکم و کثرۃ الضحک فانھا تمیت القلب)) (۴)

ہنسنا جائز ہے مگر اس کی کثرت دل کو مردہ کردیتی ہے۔ حضرت فرید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

دل زپُر گفتن بمیرد در بدن گرچہ گفتارش بود دُرِّ عدن (۵)

اور اگر باتیں بھی زیادہ نہ ہوں تو کم از کم دل تو اس کی طرف جب تک بیٹھے رہو گے بلاضرورت متوجہ رہے گا۔ تو یہی کس قدر ضرر ہے کہ قلب کو غیر اللہ کی طرف بلاضرورت مشغول کیا گیا۔ اس ضرر کا احساس ان لوگوں کو ہوسکتا ہے جن کو خدا کی طرف دل لگانے میں کچھ مزا حاصل ہے۔

---

(۱) اس زمانہ میں اگر کوئی بے عیب دوست تلاش کیا جاسکتا ہے تو وہ صراحی مئے ناب اور سفینۂ غزل ہی ہے (اس شعر میں صراحۂ مئے ناب سے مراد محبت الٰہی ہے اور سفینۂ غزل سے مراد ملفوظات ہیں) (۲) غیر کامل کی صحبت، اس سے میں جول اور اس کے پاس بیٹھنا سب چھوڑ دو (۳) اگر اس کے پاس بیٹھنے سے حرام میں مبتلا نہ ہوئے تو مباحات میں وقت ضائع کروگے (۴) زیادہ ہنسنے سے احتراز کرو کیونکہ اس سے دل مردہ ہوجاتا ہے (۵) زیادہ باتیں کرنے سے جسم میں دل مردہ ہوجاتا ہے۔ اگرچہ تمہارا کلام مثل عدن کے موتیوں کے خوبصورت ہی کیوں نہ ہو۔

توجہ متعارف کی ناپسندیدگی کی وجہ

اسی راز کی وجہ سے ہمارے اکابر نے توجہ متعارف کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ اس میں شرط یہ ہے کہ مخاطب کیطرف ہمہ تن متوجہ ہو کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا تصور بھی اس کے تصور سے زیادہ نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے حضرات کو کسی وقت بھی کسی چیز کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوتی ممکن ہے کسی وقت کسی چیز کی طرف ان کو بھی زیادہ توجہ ہوتی ہو مگر ایک تو اتفاقاً بلا قصد ایسا ہو جائے اور ایک یہ کہ قصداً ایسی توجہ کر بیٹھے کہ خدا کا تصور بھی اگر آئے تو اس کو مغلوب کیا جائے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے حضرات کو قصداً ایسا کرنا پسند نہیں۔ اور بلا قصد کسی شے کی طرف توجہ ہو جائے وہ اور بات ہے۔ اپنی طرف سے وہ ہمیشہ یہی قصد رکھتے ہیں کہ توجہ الی اللہ سب سے زیادہ ہو اور کوئی شے اس سے مانع نہ ہو۔ باقی جو لوگ توجہ متعارف کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں میں ان پر اعتراض نہیں کرتا ان کی نیت بخیر ہوگی تو ان کو بھی کچھ ثواب مل جائے گا۔ وہ نیت یہ ہوگی کہ توجہ للہ بجائے توجہ الی اللہ کے ہے مگر عاشق کو کب گوارا ہے کہ قصد اغیر کی طرف متوجہ ہو۔

حکایت

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شاعر نے ایک محفل میں یہ شعر پڑھا

اس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں تا نظر کام کرے روبہ قفا جاتے ہیں

وہاں ایک اور شاعر بھی تھا، اس نے فوراً اس کا رد کیا اور کہا ؎

اس کے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں وہ ہوسناک ہیں جو روبہ قفا جاتے ہیں

یہ شخص عاشق تھا کیونکہ اس مضمون کو عاشق ہی رد کر سکتا ہے ورنہ ظاہر میں پہلے شعر کا مضمون بھی اچھا تھا مگر مذاقِ عشق کے خلاف تھا۔ حضرت! عاشق کا مذاق

تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دم بھی محبوب سے غافل ہونے کو گوارا نہیں کرسکتا۔ اپنی طرف سے ہر دم وہ ادھر ہی متوجہ رہتا ہے خواہ محبوب متوجہ ہو یا نہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے ؎

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے پر تم کو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے

مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں راہ می تراش و می خراش تادمِ آخر دے فارغ مباش(۱)

یہ می تراش و می خراش دھیان اور دہن ہی کا ترجمہ ہے کہ ہر وقت اِدھر لَو لگی ہے کیوں ؎

تادم آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود(۲)
یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے گندا آگاہ نباشی(۳)

بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کوئی بدانتظام ہو جس سے نباہ کر کام نہ ہوتا ہو کبھی تو توجہ الی اللہ زیادہ ہوتی ہے کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا۔ معمولات بھی پابندی سے ادا نہیں ہوتے تو وہ بھی گھبرائے نہیں۔ کیونکہ حضرت اُستاد علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے اس بدنظمی اور عدمِ دوام کی شکایت کی تھی، تو حضرت نے فرمایا کہ ہر شخص کا دوام جدا ہے۔

کام میں لگے رہو

دوام کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ کبھی ہو کبھی نہ ہو۔ یعنی ایسی حالت پر

(۱) اس راہ تصوف میں ہر وقت اللہ کی طلب اور اس کی دھن میں رہو آخر وقت تک اس طلب سے غافل نہ ہو (۲) شاید کہ آخری وقت ہی اللہ کی عنایت متوجہ ہو جائے (۳) ایک لحہ کے لئے بھی اللہ سے غافل نہ ہو شاید اس کی رحمت متوجہ ہو اور تمہیں پتہ ہی نہ لگے۔

دوام ہوجائے کہ ذکر وفکر کو بالکل نہ چھوڑے بلکہ مہینہ میں بیس دن کام کرلیا دس دن چھوڑ دیا۔ یا دس دن کام کرلیا بیس دن چھوڑ دیا۔ اگر یوں کرتا رہا تو اس کا دوام یہی ہے یہ بھی محروم نہ رہیگا (۱)

ایک دفعہ میرے ایک دوست کا منظوم خط میرے پاس آیا جس میں اول سے آخر تک اسی بدنظمی کی شکایت تھی۔ جی چاہا کہ میں بھی شعر میں جواب دوں اور شعر بھی اسی بحر کا ہو۔ اسی وقت مثنوی کا ایک شعر یاد آیا جس میں سارے خط کا جواب تھا تو میں خوش ہوا اور میں نے لکھا ؎

دوست وارد دوست این آشفتگی کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی

یعنی ترکِ کلی سے کوشش بیہودہ ہی اچھی۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے ؎

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم

ارتکاب گناہ پر توبہ کرلو اپنے کو مردود نہ سمجھو

بلکہ میں اور ترقی کرتا ہوں کہ بدنظمی اور عدمِ دوام کا ذکر تو کیا اگر گناہ بھی ہوجائے تو جب بھی یہ نہ سمجھو کہ مردود ہوگئے بلکہ پھر بھی اللہ تعالیٰ ہی کو لپٹو اور یہ سمجھو کہ گناہ کا علاج بھی وہی کرسکتے ہیں۔

بندہ کا اللہ سے تعلق کیسا ہو

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک بار وحی آئی کہ اے موسیٰ! میرا محبوب بندہ

(۱) اور یہ حدیث کے دوام کی تقسیم نہیں ہے بلکہ ضعیف کی تقویت ہے کہ اس غیر مطلوب دوام سے وہ دوام مطلوب پیدا ہوجائے گا تو بحکم مقدمہ الشیٔ فی حکم الشیٔ اس کو مجازاً دوام فرمادیا ۱۲ منہ۔

وہ ہے جو مجھ سے ایسا تعلق رکھے جیسا بچہ ماں سے رکھتا ہے۔ پوچھا، الٰہی! یہ تعلق کیسا ہوتا ہے؟ فرمایا: کہ ماں بچہ کو مارتی ہے اور بچہ اسی کو لپٹتا ہے۔ پس گناہ کر کے بھی ان کو نہ چھوڑو بلکہ انہی سے لپٹو۔ اب بتلایئے اس سے بھی زیادہ کوئی آسان طریقہ کامیابی کا ہوگا؟ اس میں تو کوئی بھی دشواری نہیں کچھ خرچ بھی نہیں۔ اس کو اختیار کیجیے، اس سے طاعات پر استقامت اور محرمات سے اجتناب سہل ہوجائے گا کیونکہ اس سے آپ کو حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی اور طلب و محبت تو وہ چیز ہے کہ ایک طوائف کا طالب اس پر جان و مال فدا کردیتا ہے اور ایک امرد(۱) کا طالب اس کے لئے ریاست کو تباہ کردیتا ہے۔ پھر کیا خدا کا طالب اس کے لئے جان و مال سے دریغ کرے گا۔ خصوصا ایسی حالت میں کہ وہ آپ کا جان و مال تباہ بھی نہیں کرتا چاہتے بلکہ سب کو صحیح سلامت رکھ کر اس میں برکت و ترقی کا وعدہ فرماتے ہیں۔ واللّٰہ یدعو الی دار السلام(۲)

اور مشاہدہ ہے وہ اپنے طالب کو دونوں جگہ دار السلام ہی میں رکھتے ہیں۔ پس اگر اور بھی کچھ نہ ہوسکے تو کم از کم یہ آسان کام تو اختیار کرلیا جائے کہ آخرت کا دھیان اور دھن رکھا جائے مگر افسوس! عوام تو کیا علماء میں بھی اس کی کمی ہے۔ علماء میں نماز روزہ تو ہے مگر دھیان اور دھن اور اللہ تعالیٰ سے تعلق، ان سے لَو لگانا، لگنا لپٹنا، محبت میں گھلنا، یہ نہیں ہے اور بدون اس کے کام نہیں چلتا۔ کیونکہ بدون اس کے نماز روزہ پر استقامت خطرے میں رہتی ہے۔ ہر وقت مجاہدہ اور نفس سے منازعت رہتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ منازعت کے ساتھ اول تو کام ہی خود دشوار ہوتا ہے پھر اس پر دوام کی امید نہیں اور تعلق مع اللہ کے ساتھ منازعتِ نفس ختم ہوجاتی ہے اور دوام عمل کی امید غالب قریب بہ یقین ہوجاتی ہے۔ اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

(۱) نابالغ کا طالب (۲) اللہ سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سردار بمن نمائی کہ درازو دور دیدم رہ ورسم پارسائی

رسمِ پارسائی سے مُراد زہدِ خشک ہے اور رہ قلندر سے مراد طریقِ عشق ہے۔ فرماتے ہیں کہ طریق زہدِ خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے۔ مجھے تو طریقِ عشق میں چلائیے۔ آگے اُس کے بعید اور اس کے قریب ہونے کا سبب بتلاتے ہیں ؎

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی (۱)

یعنی اہل عشق میں امراض قلب تکبر وریا وغیرہ نہیں ہوتا کیونکہ عشق سب کو جلا پھونک کر فنا کردیتا ہے اور زاہدان خشک میں تکبر وعجب وریا وغیرہ بہت ہوتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں ؎

بطوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند کہ برون درچہ کردی کہ درون خانہ آئی
بزمیں چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریاء (۲)

پس طریق عشق کی ضرورت ہے کہ خدا کے ساتھ دھن اور دھیان لگا رہے اور یہ بات کتابون سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کا طریقہ وہ ہے جو ایک دنیا دار جج کہتا ہے ؎

نہ کتابون سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس کے لئے صحبت عشاق کی ضرورت ہے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ چونکہ یہ مضمون ضروری تھا اور مستورات کے

(۱) میں نے قمار خانہ میں ان تمام پاکباز لوگوں کو دیکھا ہے۔ کہ وہ جب صومعہ (عبادت خانہ) میں داخل ہوتے ہیں تو ریاء کاری کرتے ہیں (۲) جب کعبہ کے طواف کے لئے میں گیا تو حرم سے آواز آئی کہ باہر کیا کچھ کرتے رہے ہو کہ اب اندر آئے ہو۔ جب زمین پر سجدہ کرتا ہوں زمین سے آواز آتی ہے کہ تیرے ریاکارانہ سجدہ نے مجھ کو خراب کردیا ہے۔

مناسب تھا کیونکہ سہل مضمون ہے جس میں کچھ زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ اس لئے میں نے اس کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ گو دیر زیادہ ہوگئی جس سے بعض لوگوں کو دھوپ کی تکلیف ہوئی اور مستورات محبوسات کو گھٹن کی اور کھانا پکانے میں دیر کی تکلیف ہوئی (۱)۔ مگر تکلیف ہی سے راحت ہوتی ہے کچھ مضائقہ نہیں۔ اور جس وقت مضمون کی آمد ہوتی ہے اُس وقت میں مضمون کو روک نہیں سکتا۔ اس لئے میں مجبور تھا اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین (۲)

---

(۱) عورتیں پردہ میں پابند بیٹھنے کی تکلیف میں اور کھانا پکانے میں تاخیر کی تکلیف میں مبتلا ہوئیں (۲) اللہ تعالیٰ تمام پڑھنے والوں کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے محشی اور اس کی اولاد کے لئے اس کو ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۳/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ

﴿اعمال کا مشکّل ہونا﴾

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک شخص کسی نامحرم عورت کو دیکھ کر آیا تھا آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''کیا حال ہے لوگوں کا کہ ہماری مجلس میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے'' اسی طرح جب کوئی طاعت کرتا ہے تو اس کا ایک اثر اسمیں پیدا ہوتا ہے جس کا اہل کشف کو علم ہوتا ہے۔

مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا ان اعمال کے آثار قیامت کے روز شکلیں بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گی مثلاً جو چوری کر چکا ہے وہاں نظر آئیگا کہ چوری کر رہا ہے' زنا کر چکا ہے وہاں نظر آئیگا کہ زنا کر رہا ہے' غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اشکال بن کر نظر آئیں گے۔

اس کی مثال خدا نے یہ بھی پیدا کر دی ہے یعنی جس طرح بائیسکوپ کے اندر گذشتہ واقعات کی صورت میں نظر آتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن بھی یہ بائیسکوپ بن جائیگا اور اس کے ہاتھ اور پیر گراموفون کی طرح جو کچھ اس نے کیا ہے بولیں گے۔

وعظ: روح القیام

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ